# حکایاتِ خونچکاں



فیض احمد فیض

# حکایاتِ خونچکاں

# حکایاتِ خونچکاں

فیض احمد فیضؔ

نئے اُفق گورنمنٹ کالج، لاہور

سرورق ـــــــ صادقین۔ سہیل اکبر خان
تدوین ـــــــ بابر ہاشمی۔ شمشیر گوندل
نوید بٹ۔ احمد فواد
ناظم حسنین۔ حسن رضا
ناشر ـــــــ ندیم خان
قیمت ـــــــ ۳۰ روپے

# عکس

# حرفِ آغاز

میرؔ فرماتے ہیں ؎

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصورؔ ہی کا بار آیا

تاریخِ انسانی میر صاحب کے اس شعر کی بھرپور غمازی کرتی ہے۔ مسیح ہو یا کنفیوشس، منصورؔ ہو کہ سرمدؔ یا پھر فرہادؔ ہو کہ فیضؔ سبھی سقراطؔ کے سرکش قبیلے سے پیوستہ دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ گواہ ہے کہ اسی شخص کو حیاتِ دوام نصیب ہوئی جس نے حریفِ جاں ہوتے ہوئے صدائے انا الحق بلند کی اور بعد میں آنے والوں کے لیے چراغِ منزل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

فیضؔ صاحب کی شاعری اور عملی زندگی میں، میں نے کہیں کوئی تضاد نہیں پایا اور ہمیشہ انھیں حق و صداقت کا پرچم بلند کیے ہوئے دیکھا۔ وہ برونِ قفس تھے تو فرماتے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیرِ تاجِ شہی
ہمیں سے سُنّتِ منصورؔ و قیسؔ زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کجکلہی

پھر اگر وہ پسِ دیوارِ زندان دِکھائی دیتے ہیں تو پرورشِ لوح وقلم کرتے نظر آتے ہیں۔

غالبؔ نے کہا تھا ؎

رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

بہرِطور ان کی شاعری اور شخصیّت کے متعلق تحریر کرنا کوئی امرِ آساں نہیں ہے میں انھیں میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کے بعد سب سے بڑا شاعر مانتا ہُوں۔

شاھد محمود
نئے اُفق گورنمنٹ کالج — لاہور

ایلس فیض

# یادوں کے سائے

یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں معروضی بن کر بات کی جائے جو چوبیس سال تک رگِ جاں کی طرح ساتھ رہا ہے ——— ایک ایسا شخص جو میرا شوہر ہے

فیض پر لکھتے وقت ذاتی باتیں اور مشترک تجربات کرشمہ کی طرح دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ لیکن جب انتخاب کا یہ مرحلہ آجائے کہ "کیا لکھوں"، تو وہی باتیں چلنی چاہئیں جو دوسروں کی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کر سکیں۔ دوسروں کے دلوں کو یوں چھولیں کہ ان کا لمس، تبسم اور قہقہہ کی تحریک بن سکے ——— یہی نہیں بلکہ وہ باتیں آنسوؤں کی سرحد تک پہنچا دیں۔

میں ماضی کی طرف دیکھتی ہوں ——— اور میری نگاہیں ناگزیر طور پر زنداں کے دروازوں سے ہو کر ماضی تک پہنچتی ہیں۔ جیل کے یہ سال ہماری باہمی زندگی میں ایک رخنہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر ان برسوں نے ہم دونوں کو وہ کچھ دیا ہے۔ جو کسی طرح بھی ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے چند سال جن میں گھٹنیوں چلتی ہوئی ایک بچی، چھوٹی سی لڑکی بن گئی۔ جن میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ نوجوان خاتون بن گئی۔ جن میں زندگی کے ایک اچانک موڑ کی طرح "کسی" کے سر کے بالوں پر سفیدی غالب آگئی اور کسی کے چہرے پر جھریاں ——— آہستہ آہستہ اپنا جال بنتی رہیں ——— زنداں کے دروازے ہمارے درمیان حائل تھے ——— لیکن ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے ان سے نکلتے ہوئے، زنجیروں کی جھنکار اور تالوں میں کنجیوں کے گھومنے کی آواز کے ساتھ زنجیر و سلاسل کے یہ ایام اپنے جلو میں مسرت سے بھرپور لمحے لے کر آئے۔ ناقابلِ یقین طور پر خوشیوں سے گل بداماں لمحے ——— میں ان دنوں کے غم بلکہ غموں کی بات نہیں کروں گی۔ کیونکہ موت (اور غم) نے اپنی خواشیں ہم دونوں کو دی ہیں ——— میں تو خوشی کے لمحوں کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ سورج کی روشنی سے یہ بیتے ہوئے لمحات جگمگا اٹھیں ——— حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سائے بھی اتنے ہی عزیز ہوتے ہیں۔

جب مارچ کی ایک صبح کو فیض نے مجھے اور سوتے ہوئے بچوں کو خدا حافظ کہا تو میرے سامنے سب سے پہلا اور سنگین مسئلہ یہ تھا کہ چار سو روپے ماہانہ کی آمدنی سے گھر کیسے چلایا جائے گا۔ بادلِ ناخواستہ ہم نے شفیع اللہ کے علاوہ دوسرے پرانے نوکروں کو الگ کر دیا۔ شفیع اللہ جو، اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ فیض کی سراپا اخلاص سوتیلی بہن بالی ہمارے ساتھ رہنے کے لئے آ گئیں۔ تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی بسر کرنے میں میری مدد کر سکے۔ پہلی ضرب ہمارے بچوں پر پڑی۔ کوئن میری کالج سے ان کا نام کٹوا کر کنیارڈ مشن اسکول میں داخل کرانا پڑا۔ اب مجھے تو اس بات کا اندازہ بعد میں ہوا کہ یہ فیصلہ ہماری بچیوں کے لئے کتنا سود مند ثابت ہوا۔ منیزہ اکثر مجھے بُرا بھلا کہتی۔ "جب ابو یہاں تھے تو میرے پاس ایک آیا تھی۔ اسکول میں جھولے تھے۔ چکر گھنی تھی۔ طرح طرح کے کھیل تھے۔ ....." اپنے نئے ماحول میں اسے فرش پر بیٹھنا پڑتا لیکن وعا کے نئے طریقوں نے اس میں ایک عجیب سا ذہنی اور نفسیاتی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ میری نند کے احتجاج کے باوجود وہ رات کو سونے سے پہلے اپنے گھٹنوں پر جھک کر نیم رکوع کے سے عالم میں آسمانی باپ کی حمد ——— بگڑی ہوئی اور قدرے مضحک اُردو میں سناتی۔ ایک رات جب وہ اپنے خالق سے معروفِ کلام تھی اور ہم اسے سلانے کے لئے منتظر تھے اس نے کہا۔ "اور آسمانی باپ ..... تم جو حیدر آباد جیل میں ہو، جلدی سے واپس آ جاؤ۔" جب ہم نے اپنی گھٹی ہوئی ہنسی پر قابو پا لیا اور منیزہ کی باقی دعا سن لی تو اسے بستر میں لٹا دیا۔ پھر اسے نیم بیداری کے عالم میں، یہ کہتے ہوئے سنا "باجی ——— بہت جلد، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

جیل میں ملاقات کی اجازت مدتوں کے انتظار کے بعد ملتی اور ہر ملاقات کی یاد (اگلی ملاقات تک) ہم سینے سے لگائے رہتے۔ اگلی ملاقات تک ہر پچھلی ملاقات کی ایک ایک نگاہ، ایک ایک لفظ، ایک ایک جنبش کو ذہن و دل ایک متاعِ عزیز کی طرح محفوظ رکھتے۔ یہ ملاقاتیں دو تین مہینے میں ایک بار ہوئیں ——— ہر ملاقات کے لئے ہمیں صحرائے سندھ کی وسعتوں کو طے کرنا پڑتا۔ یہ سفر تھکا دینے والے بھی تھے اور پھر اس تھکن پر اخراجات کا اضافہ کیجئے۔ جیلر ہر ملاقات کی نگرانی کرتا۔ خاص طور پر میری ملاقات کی نگرانی کیونکہ مجھے "ممکنہ" معلومات کا ذریعہ سمجھا جاتا

تھا۔ ہم ملاقات کے ان لمحوں کو ہلکے پھلکے واقعات اور دوستوں کے پیغامات سے شیریں تر بناتے تاکہ ان کا بوجھ لطافت تلے دب جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ملاقات کے موقع پر جب میں ایک کہانی سنا رہی تھی۔ ہمارا جیلر اس کہانی کی دلچسپیوں میں یوں گم ہوگیا کہ جب سنتری اور جیلر کی ڈیوٹی کا وقت پورا ہوگیا تو اس نے دوسرے جیلر سے کہا۔ "بھئی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ میں اس کہانی کا انجام تو سن لوں"۔

دوستوں نے مجھ سے اکثر پوچھا کہ بھلا کسی غیر کی موجودگی میں باتیں کیسے ہوتی ہوں گی؟ دو دلوں کی ملاقات کے درمیان ایک تیسرا وجود۔ ہر بات سنتا ہوا آدمی۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اکثر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی کب ہوتا تھا۔ ! ہاں کبھی کبھی "حجاب درمیان"، کی موجودگی، ملاقات کو آلودہ کر دیتی تھی۔ جیسے شروع شروع میں جیلر صاحب میرے اور فیض کے درمیان بیٹھنے پر اصرار فرماتے تھے۔

فیض کی گرفتاری اور ان کی غیر قانونی قید تنہائی (میں غیر قانونی اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ایک مقررہ مدت سے زیادہ کسی شخص کو قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا رکھنا غیر قانونی ہے) کے تین ماہ بعد میں اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ان سے ملنے کے لئے لائل پور جیل گئی۔ ہمیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ پھر اس نے ہم تینوں کو دیکھا۔ مجھے اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس لمحہ ہم بہت تنہا، مایوس و ملول اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہمارے چہرے ہماری ذہنی کیفیت اور زندگی کے آئینے بن گئے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا، "آپ کی یہی دو بچیاں ہیں۔ ؟" میں نے اسے بتایا کہ یہی بچیاں ہماری متاع ہیں۔ ہماری زندگی کا حاصل ضرب۔ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ کوئی لڑکا نہیں ہے ؟" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ اس نے ایک آہ بھری —— ایک طویل آہ۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "کیسے افسوس کی بات ہے۔ کیسی افسوسناک بات ——" اس کے لہجے سے مجھے یہ احساس ہوا جیسے اب کسی بیٹے کی ماں بننا میرے مقدر میں نہیں جیسے —— میرا سہاگ لُٹ چکا ہو!

اور جب فیض کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بچیاں دوڑتی ہوئی ان کی آغوش

میں سما گئیں۔ منیزہ نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا "ابو!" "وہ" کہتے تھے کہ آپ کے ہاتھ اور پیر کاٹ ڈالے جائیں گے"۔ وہ کون تھے۔ یہ مجھے کبھی نہیں معلوم ہو سکا۔ لیکن اس لمحے جب ہماری رمیزی اور فیض کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ بے چینی --- کے تجربے اور خوف سے ہم ہی نہیں گزرے تھے (بلکہ ہماری بچیاں بھی بے یقینی کے کرب میں مبتلا تھیں)

حیدرآباد تک ہمارے سفر کا مطلب تھا۔ زیادہ ملاقاتیں۔ ان موقعوں پر ہم سہروردی مرحوم کے ساتھ قیام پذیر ہوتے۔ جو "ملزم" کی قانونی پیروی کر رہے تھے۔ سلیمہ اور منیزہ سہروردی صاحب سے جیسے بے ساختہ پیار کرنے لگیں اور ان سے قریب ہوتی گئیں۔ سہروردی مرحوم بچیوں کے لئے رقص کی موسیقی کی دھن پر والٹز کرتے ---- دائرہ میں رقص ---- ایک دن سلیمہ نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا "آج میں نہیں ناچوں گی"۔ لیکن منیزہ فوراً اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ سہروردی صاحب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پرانی دنیا کے آداب کی سراپا تصویر بن کر جیسے رقص کی فرمائش کرتے ہوئے قدرے جھکے۔ منیزہ نے ایک نوجوان خاتون کی طرح جھک کر اس درخواست کو قبول کر لیا۔ سہروردی صاحب کا چہرہ بشاشت سے کھل اٹھا اور وہ دونوں کمرے میں ایک آہستہ اور مدہم سے فرانسیسی انداز کے شاہانہ رقص (MWUET) میں مصروف ہو گئے بعد میں سہروردی صاحب نے گاڑی میں دریائے سندھ تک چلنے کی تجویز پیش کی اور پھر دریا کی موجوں پر کشتی چلاتے ہوئے انہوں نے ہمیں ایک پنجابی لوک گیت سنایا جو لڑکیوں کو پہلے یاد تھا۔ یہ سب کچھ کس قدر پُر لطف تھا۔ لیکن جب ہم یہ سوچتے کہ یہ ذہین اور صاحبِ جوہر آدمی کل صبح حصولِ انصاف کے لئے جیل کی چار دیواری کے اندر اپنی جدوجہد پھر شروع کر دے گا۔ تو ہر بات مہمل اور بے محل معلوم ہونے لگتی۔

"دربارِ وطن میں جب اک دن ....."

یہ فیض کی محبوب ترین اور مقبول ترین قوالیوں میں سے ہے۔ مجھے حیدرآباد جیل کی ایک عید یاد ہے۔ جب بیشتر قیدیوں کے خاندان یک جا ہو گئے۔ شوخ رنگوں کے زنگارنگ اور بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے اتنے بچے وہاں جمع تھے جنہیں دیکھ کر دیکھنے والا یہ بھی بھول جاتا کہ بلا کسی استثناء کے ان سب کے باپ ایسے الزامات میں ماخوذ تھے۔ جن کی بنا پر استغاثہ سزائے موت

تک کا مطالبہ کر سکتا تھا۔

عید کی اس پارٹی میں یہ قوالی جس جوش، چاؤ اور تیز دھن میں گائی گئی۔ اس کا تصور بھی ایک مشکل کام ہے ——— اور جب قوالی ختم ہوئی تو اس وقت تک تمام بچے، بیویاں اور مائیں، سب ہی اس قوالی میں شریک ہو چکی تھیں۔ سب کے ہونٹوں پر صرف یہی بول تھے ؎

دربارِ وطن میں جب اک دن ۔۔۔۔۔

ہم سب نے نہایت پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور جب ہم گھر "یعنی ڈاک بنگلے واپس پہنچے تو بچیوں نے کہا ——— "ایسا کھانا تو ہم نے بہت دنوں سے نہیں کھایا تھا۔ ہے نا امی۔"

کھانے کی بات پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب فیض کو سزا دی جا چکی تھی۔ اور وہ اپنی میعاد قید منٹگمری جیل میں پوری کر رہے تھے۔ منیزہ اور سلیمہ نے اپنے ابو کو خط میں لکھا "ہم آ رہے ہیں۔ آپ دوپہر کے کھانے کے لیے کوئی اچھی سی چیز ضرور پکا ئیے گا" ہمیں ایک ساتھ دوپہر کا کھانا، کھانے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ جب ہم لوگ منٹگمری جیل پہنچے تو نائب سپرنٹنڈنٹ لودھی صاحب نے منیزہ سے کہا "تمہارے ابو نے یقیناً" تمہارے لئے کوئی خاص چیز پکائی ہوگی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟" منیزہ نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے خط میں پڑھا تھا۔" لودھی صاحب نے جواب دیا۔ جیل کے ارباب حل وعقد یقیناً خطوں کا احتساب کرتے تھے۔ منیزہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "تو کیا تم میرے خط پڑھتے ہو؟"

"ہاں" لودھی صاحب بولے۔

اُف ! بدتمیز کہیں کے۔"

میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جملہ سن کر لودھی صاحب پر کیا بیتی۔ لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے چہرے پر اس وقت کیسے تاثرات تھے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ بیچارے لودھی صاحب۔

جب ۱۹۵۹ء کے ابتدائی مہینوں میں مارشل لاء کے تحت فیض پھر مہمان زنداں بنے تو لاہور میں منتقل کر دیئے گئے۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست دی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ذمہ داروں نے دانستہ جھوٹ سے کام لیا۔ انہوں نے اس بات سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ فیض لاہور جیل سے

قلعہ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس دانستہ جھوٹ کی وجہ سے ایں لاہور جیل گئی اور وہاں پتہ چلا کہ فیض تو وہاں سے جا چکے ہیں۔ اور جب میں نے ملاقات کے لئے دوبارہ درخواست دی تو میں غصہ کے مارے سچ مچ ابل پڑی تھی۔ آخر کار میں اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ قلعہ لاہور پہنچی۔ فیض کو ان کی کوٹھری سے بلایا گیا۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یا تو انہیں شیو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی یا انہوں نے خود ہی داڑھی بنانے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ ان کے "پچھلے چوبیں گھنٹے" خوشگوار ہرگز نہ تھے۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے ناشتہ کیا ہے؟"

فیض نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں"

"کیا؟" یہ تھا میرا دوسرا سوال۔

"او ایک بنؔ۔ ایک پیالی چائے۔" فیض نے جواب دیا۔

"بن" کا لفظ سنتے ہی میں جیسے بارود بن گئی۔ جیسے کسی نے بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میرے مزاج کی یہ کیفیت کیونکر ہوئی؟ اس کا جواب خود مجھے بھی کبھی نہ مل سکا۔ لیکن شاید اس وقت "بن" ایک علامت بن گیا تھا۔ ایک اشارہ۔ ان تمام ناانصافیوں، دکھ درد، ذلت فریب اور دروغ گوئی کا جن کا میں گزشتہ کئی ماہ سے شکار تھی۔

میں غصہ سے بے قرار ہو کر جیلر کی طرف پلٹی اور چیخ اٹھی "تم نے میرے شوہر کو بن دیا۔ صرف بن!" جیلر کا منہ کھلا۔ مگر میں نے اسے ایک لفظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ میں پھر برس پڑی "تم کیا جانو۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بن نہیں کھایا۔ تم نے بن ہی تو کہا تھا؟ بن بن"

بیچارہ غریب آدمی کچھ نہ بولا۔ لیکن اپنی پُرجوش خطابت کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ ایسا اطمینان جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس وحشت آمیز اور زخمناک ساعت کے ایک گھنٹہ بعد جب میں گھر گئی تو میں نے انڈوں، مکھن، ڈبل روٹی سے ایک ٹوکری بھری اور جیلر کے نام ایک پرزہ لکھ کر بھیج دیا کہ "ناشتہ اس قسم کی چیز کو کہا جاتا ہے۔"

---

ؔ عام اُردو تلفظ اب تو "بند" ہو گیا ہے۔ مُسکہ بند۔

بعد میں "بن" کے واقعہ پر ہم دونوں بے تحاشہ ہنسا کرتے تھے۔ ایسی ہنسی جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔ کیونکہ قلعہ لاہور کی کسی کال کوٹھری میں مقید آدمی کے لئے "بن" کی اہمیت ہی کیا تھی؟

لیکن شاید اس وقت اس بن کی اہمیت اس طویل اور تھکا دینے والی تنہائی اور رکھو کھلے بن سے وابستہ ہو گئی تھی۔ جو مستقبل کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔

میری ساس نے مجھے بعد میں بتایا کہ میری پرجوش تقریر کو سن کر وہ یہ سمجھی تھیں کہ فیض کو شاید قلعہ میں اذیت پہنچائی گئی تھی جس پر میں بگڑ رہی تھی۔

فیض سے (مختلف جیلوں میں) ملنے کے لئے ہمیں اکثر ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ تیسرے اور درمیانے درجے میں سفر کرتے تھے۔ اسی لئے بچیوں کو ہم سفروں سے گفتگو بھی ذرا زیادہ ہی کرنی پڑتی تھی۔ (اونچے کلاسوں کے مسافر، توبہ۔ کسے را با کسے کارے نہ باشد) سلیمہ سے جب کوئی پوچھتا کہ اس کے والد کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ تو وہ جھجک جاتی تھی۔ ایک ایسے موقع پر میں نے اسے یہ کہتے سنا (اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا کیونکہ اسے سفید جھوٹ سے نفرت تھی)، "ابو حیدر آباد میں کام کرتے ہیں"۔ منیزہ اس کی طرف مڑی اور غصے میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی "چل جھوٹی کہیں کی، وہ جیل میں ہیں"۔

کچھ دن ہوئے مجھے ایک کاپی ملی۔ جس میں جیل سے فیض کی واپسی کے بعد تک کے واقعات ہیں۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد ہمیں ایک بار پھر فیض کو اپنی گھریلو زندگی کا حصہ بنانا تھا۔ ہماری گھریلو زندگی جو پدری نظام کی جگہ ایک خالص اور مضبوط مادری نظام بن گئی تھی۔ اس کاپی کو "وحدت کا منصوبہ" (ONE UNIT PLON) کہتے تھے اور ہم میں سے ہر ایک کا نام پاکستان کے کسی سابق صوبہ کے نام پر تھا۔ اس وحدت میں ایک بھانجا بھی شامل تھا۔ ہمارا کام اور فریضہ یہ تھا کہ پرانی اور نئی عادتوں میں اور گھر کے نئے ارکان کے ساتھ اختلافِ رائے کا تصفیہ کریں۔ گھریلو زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لئے۔

ہم ہر ہفتے ایک جلسہ کرتے تھے۔ شکایات پیش ہوتی تھیں۔ اور ان کے حل تلاش کیے جاتے تھے۔

اب میں اس کاپی پر نظر ڈالتی ہوں تو ایسی تحریریں اور یادداشتیں نظر آتی ہیں۔

"میں کچھ سہیلیوں کو چائے پر بلانا چاہتی ہوں۔ کیا اس کی گنجائش نکل سکتی ہے"۔

"ہمیں گھر پر سالگرہ کی پارٹی کرنی چاہیئے۔"

"ابو کو بال روم ڈانسنگ سیکھنے کی مشق کرنی چاہیئے۔"

"نصیر کو اپنی الماری کے خانے خود صاف کرنے چاہئیں۔"

ابو کو ایک دن میں تیس سے زیادہ سگریٹ نہیں پھونکنے چاہئیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو میں یہ شکایت کاپی پر پانچ مرتبہ لکھوں گی۔"

"گھر پر جب کوئی دعوت ہو تو بڑوں کے ساتھ بچوں کو بھی بلایا جائے۔" کبھی کبھی "سرحدی علاقہ" کی طرح منیزہ ہیجان پرور بنجاتی اور شور مچاتی۔ اس کی زندگی میں یہ نئے مطالبقت خاموشی کے ساتھ نہیں آئی۔ فیض "سندھ" تھے کیونکہ سلیمہ کہتی تھی "ابو تو سندھ سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔" اور میں "بلوچستان" تھی شاید اس لیے کہ کبھی کبھی میں دوسروں کے لئے زحمت اور تکلیف کا سبب بن جاتی۔ ہمارے مالی وسائل محدود تھے اور مطالبے بڑھتے ہی جاتے تھے اور ہمیں بہت ہی اچھی چیزوں کی تحدید کرنی پڑتی تھی۔ (آسان اُردو میں راشن بندی) اور یہ تحدید اس وقت تک لازم تھی جب تک فیض جیل سے لوٹ کر دوبارہ کام شروع نہ کر دیتے۔ لیکن جلد ہی ہمارا جمہوری نظام کامیاب ہو گیا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد ہمارا گھر اس نہج پر چل رہا تھا۔ جیسے گھر کا سرپرست ——— اُس گھر سے باہر کبھی گیا ہی نہ ہو۔

سجاد ظہیر

# شخص و عکس

محمود امرتسر میں دو ڈیڑھ سال سے تھے لیکن ان کی یا رشیدہ کی پنجاب کے ادیبوں سے اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی وہ پڑھانے میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی کام میں مشغول رہتے۔ رشیدہ ڈاکٹری کرتیں یا کبھی کبھی افسانے لکھ لیتیں۔ ہم نے مشورہ کیا کہ لاہور چلیں اور وہاں اپنے مشترک دوست میاں افتخار الدین اور دوستوں سے مدد لے کر ادیبوں سے ملیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم لاہور جائیں ہمیں غیر متوقع بلکہ غیبی مدد ملی۔ امرتسر میں میرے ایک دو دن کے قیام کے بعد ایک دن رشیدہ نے یکبارگی کہا، "محمود! وہ تمہارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے نا، انگلش ڈیپارٹمنٹ میں کیا نام ہے اس کا؟" اور پھر میری طرف مڑ کر "میرے خیال میں تم اس سے مل لو"

محمود بہت سنجیدگی سے انگریزی میں "بولئے تمہارا مطلب ہے۔ ہمارے انگریزی کے نئے لکچرر رفیض احمد!"

"انہہ، ہوگا بھئی کوئی بھی نام مجھے یاد نہیں رہتا، وہ بولتا تو ہے نہیں۔ تمہارے کالج میں وہی ایک لڑکا سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ بنّے کو اس سے ملنا چاہئیے۔"

محمود صاحب نے اس بات کو اپنے کالج اور اس کا وائس پرنسپل ہونے کی حیثیت سے اپنے اوپر حملہ تصور کیا اور ذرا تیزی سے بولے، "او تمہیں کیا معلوم میرے کالج میں کون سمجھدار ہے اور کون نہیں؟ تم کتنوں سے ملی ہو؟ اور جن سے تم ملی بھی ہو ان کے نام تک تو تمہیں یاد نہیں۔"

اب کیا تھا رشیدہ بالکل اپنے اصلی رنگ میں آگئیں اور چمک کر بولیں، "سب اُلّو بھرے ہیں تمہارے کالج میں جنہیں الف کے نام ب تک نہیں آتا۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں۔

میں اسٹاف کی بات کرتی ہوں۔ لڑکوں کی نہیں۔ نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ صورت سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔"

اس پر ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا "اچھا بھئی! یہ طے کرو کہ ان سبھ دار فیض احمد صاحب سے کب ملاقات ہوگی۔"

محمود صاحب نے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی فیض سے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کر لی ہیں اور تمہارا ابھی ان سے ذکر کر دیا ہے۔" پھر اپنی ڈائری دیکھ کر کہا۔ "آج ساڑھے چار بجے چاء پر فیض آ رہے ہیں۔"

"دیکھا تم نے ان حضرت کی باتیں" رشیدہ نے مجھ سے فریاد کے لہجہ میں کہا "میں نے بھی تو آخر یہی کہا تھا کہ فیض کو ستم سے ملانا چاہیئے۔ یہ خواہ مخواہ گھنٹے بھر سے مجھ سے الجھے ہوئے ہیں۔"

محمود مسکراتے رہے کچھ نہیں بولے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے اعلان کیا۔

"میں اب کالج چلا۔ مہربانی کر کے چاء کے لئے سینڈوچ وغیرہ بنوا لینا" پھر ڈائری دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "اور کل چاء پی کر ہم موٹر سے لاہور کے لئے روانہ ہوں گے۔ فیض بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ میں نے افتخار کو اطلاع کر دی ہے۔ ہم ان کے یہاں ہی ٹھہریں گے۔ فیض اپنے گھر ٹھہریں گے۔"

"اور کچھ طے ہوا ہو تو وہ بھی ابھی بتا دو۔ ذرا ڈائری کا اگلا صفحہ تو دیکھو، برک فاسٹ اور لنچ کس کے یہاں کھانا پڑے گا؟" رشیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

"یو آر جسٹ امپوسبل" محمود نے کہا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

بارے تیسرے پہر جب "فیض احمد صاحب" سے ملاقات ہوئی تو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ یعنی فیض نہیں بولے۔ کسی نئے آدمی سے گفتگو شروع کرنے اور اسے جاری رکھنے کا مشکل فن مجھے بھی نہیں آتا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا۔ کہ اس میدان میں مجھ سے بھی بڑے اناڑی پائے جاتے ہیں۔

فیض کی رازداری کا کمال یہ تھا کہ اس وقت تک محمود اور رشیدہ کو اس کا بالکل علم نہیں

تھا کہ فیض شاعری بھی کرتے ہیں ان کی نظر میں تو بس وہ ادب خاص طور پر انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ذہین نوجوان تھے۔ جن میں کچھ کچھ ترقی پسند رجحانات پائے جاتے تھے۔ محمود نے مجھ سے ان کے ذوق سلیم کی تعریف کی تھی۔ جس کا پتہ انہیں اس طرح چلا تھا کہ محمود کے یہاں سے اچھی اچھی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لئے جایا کرتے اور انہیں بڑے شوق سے پڑھتے۔

ہم نے شاید انگلستان کے نئے شاعر اسٹیفن اسپنڈر اور آڈن کا تذکرہ کیا۔ جن کے شعر کے نئے مجموعے ان دنوں شائع ہوئے تھے اور جن کی شاعری میں انگریزی شاعری کے مروجہ ٹی ایس ایلیٹ کے پھیلائے ہوئے تلخی اور نامرادی کے رجحانات سے الگ ہٹ کر انسانیت کے نئے اشتراکی مستقبل اور یورپی عوام کی فاشسٹ دشمن جدوجہد کی امید جھلک تھی۔ مجھے اس پر کافی تعجب ہوا کہ فیض ان شاعروں کا کلام پڑھ چکے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہم نے اس وقت تک جو کیا تھا۔ سب بتایا اور ان سے پوچھا کہ پنجاب میں اس کے کیا امکانات ہیں۔ فیض نے اپنے بشرے سے کسی خاص گرمجوشی یا انہماک کے جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا بس ایک پشیمان سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

"لاہور چل کے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں پر کچھ لوگ شاید ہم سے متفق ہوں گے۔"

معلوم ہوتا تھا کہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ سنیں گے، مسکرائیں گے۔ مگر بولیں گے نہیں۔ آخر کو رشیدہ جیلا پڑیں۔

"یہ بھی خوب کہی، کچھ لوگ شاید متفق ہوں گے۔ جناب ہمیں اس مینی فیسٹو پر بہت سے لوگوں کے دستخط لینے ہیں اور پھر لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانی ہے۔"

محمود اور میں رشیدہ کی اس حرکت سے گھبرا سے گئے۔ ابھی ہماری فیض سے بے تکلفی نہیں تھی، اور میری تو بالکل پہلی ملاقات تھی اور رشیدہ تھیں کہ اس ہمارے شرمیلے مہمان کی نقلیں کرنے لگیں اور اس پر فقرے چست کر رہی تھیں۔ لیکن انہیں روکنے یا منع کرنے کی کسے ہمت تھی۔ پھر بھی فیض ٹس سے مس نہ ہوئے البتہ اب کی ذرا اور کھل کر مسکرائے اور بولے

"لاہور چل کے کوشش کرتے ہیں، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

ہم اپنے پروگرام کے مطابق اس کے دوسرے دن لاہور چل پڑے اور چراغ جلے

وہاں پہنچ گئے۔ فیض اپنے گھر چلے گئے اور ہم تینوں سیدھے کینال بنک میاں افتخارالدین کی کوٹھی پر گئے وہاں میاں صاحب کے نوکروں نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کسی پارٹی پر گئے ہیں۔ ہم جاڑے میں شام کے وقت ۳۰۔۴۰ میل موٹر پر چل کر آئے تھے۔ اس لئے کافی ٹھٹھرے ہوئے تھے اندر آتشدان میں بڑی اچھی آگ جل رہی تھی۔ چپ چاپ اس کے گرد جاکر بیٹھ گئے۔ نوکر جلدی سے ہمارے لئے چائے بنا کر لائے آگ کی گرمی اور چائے نے ہمارے موڈ پر اچھا اثر ڈالا۔ رشیدہ ایک نرم کشن میں منہ چھپا کر قالین لیٹ گئیں محمود کا ہاتھ آہستہ سے اپنے جیب میں گیا اور انہوں نے پائپ نکال کر پینا شروع کردیا۔ لیکن وہ وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی نوٹ بک برآمد کی اور میرے ساتھ دوسرے دن کا پروگرام طے کرنے لگے ان کے نوٹ بک میں ۲۰۔ ۲۵ ناموں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ لاہور کے ادیبوں، شاعروں، ادب میں دلچسپی لینے والوں ادب کے مددگاروں، آرٹسٹوں، پروفیسروں کی فہرست، انہوں نے کہا میرے لئے ضروری ہے کہ ان سب سے فرداً فرداً ملوں اس انکشاف پر مجھے کافی تعجب ہوا اور میں نے ان سے پوچھا "تم تو کہتے تھے کہ تم یہاں کے ادیبوں کو جانتے ہی نہیں پھر یہ اتنی بڑی فہرست کیسے بنالی؟" انہوں نے جواب دیا۔

"تمہارے آنے سے پہلے فیض اور میں اس معاملے کے متعلق کئی بار باتیں کرچکے ہیں۔ میں تو ان سے ایک ہی دو سے واقف ہوں۔ لیکن فیض اکثر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ یہ فہرست انہیں نے لکھوائی ہے۔"

مجھے محمود کی اس مستعدی سے بڑی خوشی ہوئی۔

یار تم سے جو بات بھی پوچھتے ہیں، تم یہی کہتے ہو کہ فیض نے اور میں نے پہلے ہی سے طے کرلیا ہے۔ میرے لئے تو تم نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اتنے دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی"۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"بھئی اصل بات یہ ہے کہ فیض کے ساتھ پنجاب میں پروگریسو رائٹرز موومنٹ آرگنائز کرنے کے بارے میں میں نے کئی بار تفصیل سے باتیں کی تھیں اور ہم خود لاہور آتے۔ اتنی جلدی تمہارے یہاں آنے کی تو ہمیں امید بھی نہیں تھی"۔

اس کے بعد چند دن فیض کی رہنمائی میں لاہور کے مختلف ادیبوں سے ان کے گھر جاکر ملنے میں گزرے لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے مجھے صرف دو سے ملنا صاف طور پر یاد ہے۔ ایک صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور دوسرے اختر شیرانی مرحوم۔

فیض شاید صوفی صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے اس لئے وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے اور غالباً رشیدہ اور محمود بھی فیض کے توسل سے ان سے پہلے سے واقف تھے۔

اختر شیرانی کے یہاں بھی مجھے فیض لے گئے۔!

اختر شیرانی کو دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہوا میں نے پریشان ہو کر فیض کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی ملی جلی کیفیت تھی۔ زبان سے کچھ بولے بغیر جیسے انہوں نے مجھ سے کہدیا کہ "ایک اختر شیرانی ہی نہیں، ہمارے زیادہ تر ادیب، شاعر، اہلِ فن انہیں روح فرسا حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبھی تو ہم اس اپنی تحریک کو شروع کر رہے ہیں" فیض نے اختر شیرانی سے میرا تعارف کرایا اور ان سے ملنے کا مقصد بتایا میں نے مختصراً ترقی پسند ادب کی مجوزہ تحریک کے بارے میں ان سے کچھ باتیں کیں۔

دو تین دن کی دوا دوش کے بعد جس میں اب میاں افتخار الدین بھی ہمارے ساتھ پورے جوش وخروش سے شریک ہو گئے تھے۔ ہم نے ان پندرہ بیس آدمیوں کو جنہیں ہم سمجھتے تھے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں دلچسپی لیں گے۔ ایک ساتھ مل کر گفتگو اور مشورے کے لئے مدعو کیا۔ یہ اجتماع افتخار کے ہی گھر پر ہوا ان کے مکان کے سامنے کے خوبصورت لان پر چار بجے کے قریب ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ رشیدہ۔ محمود، فیض افتخار اور میں وہاں پہلے سے موجود تھے۔ افتخار میزبان ہونے کے ناتے چائے وغیرہ کے انتظام کے لئے اپنے نوکروں کو ادھر سے ادھر بھگا رہے۔ ہماری گھبراہٹ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ جس کا اظہار اس وقت ہماری غیر معمولی خاموشی سے ہو رہا تھا۔ فیض حسب دستور بظاہر اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے۔ اور ان کے اس اطمینان پر رشیدہ تو رشیدہ مجھے بھی جو اپنے کو کافی ٹھنڈے دل ودماغ کا انسان تصور کرتا ہوں کسی قدر غصہ سا آ رہا تھا لیکن ہم سب نے اپنے جذبات کو اس وقت دبائے رکھا۔

اب تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں انجمن کی تشکیل کی جائے۔ فیض نے تجویز پیش کی کہ صوفی تبسم کو اسی وقت عارضی طور پر انجمن کا سیکرٹری چن لیا جائے جب انجمن کے ممبر بن جائیں گے۔ تو اس کے باقاعدہ عہدے داروں کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صوفی صاحب نے پہلے انکار کیا لیکن بعد کو اصرار کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس چھوٹے سے جلسے کے ختم ہوتے ہوتے سورج ڈوب چکا تھا۔ سردی یکبارگی بڑھ گئی۔ لوگ جلدی جلدی رخصت ہونے لگے۔

ہم خوش اور مطمئن تھے، رشیدہ فیض کو چھیڑ رہی تھیں۔ اب وہ حضرت بھی کسی قدر بگھلے اور بولنے چالنے پر رضامند ——— سے معلوم ہو رہے تھے۔

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقدہ لکھنو کا نفرنس کا پہلا سیشن خاتمہ کے قریب رہا ہوگا۔ ساغر نظامی افتاں و خیزاں وارد ہوئے۔ ساغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کو کانفرنس میں آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ صبح سے نیاز صاحب (نیاز فتحپوری) کے یہاں بیٹھے تھے اور نیاز صاحب اس کے منتظر تھے کہ کانفرنس کے منتظمین میں سے کوئی ان کے لئے سواری لے کر ان کے مکان پر پہنچے تب وہ تشریف لے چلیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے انتظار کے بعد ساغر تو تانگے پر بیٹھ کر خود ہی کانفرنس تک آ گئے لیکن مولانا نیاز اس لئے تشریف نہیں لائے کہ کوئی انہیں لانے کے لئے نہیں گیا۔ وہ ہم سے روٹھ گئے تھے۔ ہمیں اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی اور اپنی محرومی کا رنج۔ لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دو ممتاز ادباء پریم چند اور حسرت موہانی بالکل دوسری طرح سے ہماری کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے روپے کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجے میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے اور تکلیف دہ جگہوں پر ٹھہرے تھے۔ پنجاب کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ کو چپکے سے بتایا کہ ان کے پاس بس لکھنؤ آنے جانے بھر کا کرایہ تو تھا لیکن اب سگریٹ یا تانگے کے کرائے تک کے لئے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ یقینی ان لوگوں اور مولانا نیاز میں نمایاں فرق تھا۔

(ترقی پسند مصنفین پنجاب کی پہلی صوبائی کانفرنس منعقدہ امرتسر) ہم نے بہت کوشش

کی کہ مقامی کالجوں یا سکولوں میں سے کوئی دن کانفرنس کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا ہال دیدے لیکن کوئی بھی راضی نہیں ہوا۔ آخر کو ہم نے کسان کانفرنس والوں سے کہا وہ بڑی خوشی سے خالی وقت میں اپنا پنڈال دینے کے لئے راضی ہو گئے۔ اچھا ہے۔ پنجاب کے کسان اپنے عوامی مصنفین کی صورتیں تو دیکھ لیں اور مصنفین کے لئے بھی کسانوں کے سائے میں اپنی کارروائی کرنا مفید ہوگا مجھے تعجب اس پر تھا کہ ایم اے۔ او کالج والوں نے بھی ہال نہیں دیا۔ تاثیر اس کے پرنسپل تھے اور فیض وہاں پڑھاتے تھے۔ فیض نے کہا "بس سمجھ لیجئے یہاں کے بعض حلقے ہماری انجمن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔"

اس کانفرنس کی روداد مجھے یاد نہیں ممکن ہے فیض کو یاد ہو۔ یا ان کے پاس کانفرنس کی تجاویز اور بحثوں کی رپورٹ محفوظ ہو۔

(ترقی پسندوں کے مخالفین سے ایک مناظرہ منعقدہ دہلی) دہلی میونسپل کارپوریشن کے بڑے ہال میں جلسہ ہونا قرار پایا۔ سر رضا علی (مرحوم) اس کی صدارت کے لئے بلائے گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک پر حملہ کرنے کے لئے دلی کے دو نامور اصحاب تھے۔ خواجہ محمد شفیع، ناول اور افسانہ نگار اور شاعر —— دوسرے مولوی سعید احمد تھے —— مولوی صاحب ندوۃ المصنفین (دہلی) کے ایک رکن تھے اور اس ادارے کے ماہانہ علمی اور دینی رسالے "برہان" کے ایڈیٹر تھے۔ ترقی پسندوں کی طرف سے اس حملے کا بچاؤ کرنے کے لئے فیض احمد فیض اور میں چنے گئے تھے۔ —— جلسے کی کارروائی صدر سر رضا علی کی تقریر ہی سے شروع ہوئی —— اس کے بعد خواجہ محمد شفیع صاحب نے تقریر کی۔ خواجہ صاحب کی تقریر نہیں تھی ترقی پسندوں پر چوٹوں کا ایک سلسلہ تھا۔ انہوں نے آزاد شاعری کا مذاق اڑایا۔ زبان کی غلطیاں بتائیں۔ ان کے تصورات کو مخرب اخلاق اور اور غیر شاعرانہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فحاشی کا الزام بھی ہم پر لگایا گیا۔ ہم ان اعتراضات کے سننے کے عادی ہو چکے تھے گو دلی کی ٹھیٹھ زبان اور اتنے پیارے لہجے میں ہم نے اس سے پہلے گالیاں نہیں سنی تھیں۔ مجمع پر خاصا اثر ہوا اور میراجی، راشد اور محمود جالندھری کی چند نظموں کے ٹکڑے جب پڑھے گئے۔ تو اس پر کافی قہقہہ لگا۔

خواجہ صاحب کے بعد فیض بولے۔ وہ حضرت معلوم ہوتا تھا اپنے فوجی دفتر سے اٹھ کر

سیدھے جلسے میں آ گئے ہیں انہیں کپڑے بدلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور لیفٹیننٹ کرنل کی وردی زیب تن تھی۔ ان کا لباس ہی دلی والوں کو غیر ادبی معلوم ہوا ہو گا۔ مجھے کس قدر گھبراہٹ ہونے لگی فیض سے میں نے کہا۔

"کپڑے تو بدل لئے ہوتے۔" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"سب ٹھیک ہے کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں۔"

فیض تقریر شروع کرتے ہی مسئلے کی تہہ پر چلے گئے اور خواجہ صاحب کے اعتراضات کا براہ راست جواب دینے کی انہوں نے زحمت نہیں کی۔ انہوں نے عالمانہ انداز میں اور بڑی متانت سے یہ ثابت کیا کہ ترقی پسندی ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سماج میں تبدیلی اور ارتقا کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے۔ اسے روکنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ناگزیر ہے۔ البتہ اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ فیض کی تقریر میں جوش، زور طنز یا حملے کا انداز بالکل نہیں تھا۔ اس میں روانی، متانت اور درس دینے کی سی کیفیت تھی۔ مجمع نے توجہ اور خاموشی سے انکی تقریر سنی نہ قہقہے لگے اور نہ تالیاں بجیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور کے رسالہ "ادب لطیف" نے ترقی پسند ادب کی خاص طور پر اور اردو ادب کی عام طور پر بہت اہم خدمت انجام دی ہے ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں غالباً فیض امرتسر سے لاہور آ گئے تھے اور ایک کالج میں انگریزی کے لکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ اس رسالے کے ایڈیٹر بھی ہو گئے۔ ان کے اداریوں اور تنقیدی مضامین نے ترقی پسند نقطہ نظر کو واضح کیا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے اس دور کے واقعات کما حقہ بیان کروں یہ کام فیض یا کرشن چندر کے کرنے کا ہے۔

۱۹۳۹ء میں جب عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کی عوامی تحریکوں پر حملہ، تو سامراجی تباہ کاری اور جبر و تشدد کی اس فضا کو ہمارے دو شاعروں مخدوم اور فیض نے اپنی دو بڑی حسین اور پُر اثر نظموں میں پیش کیا تھا۔ مخدوم نے کہا تھا۔

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند

بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن،

لیکن اس نے آخر میں یہ بشارت دی تھی۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

اور فیض نے وطن کی آزادی کے مجاہدوں سے کہا تھا کہ جبر و تشدد کے اس دور کو صرف شجاعانہ مقاومت سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

فیض نے اپنی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" میں ملک کے ان لیڈروں کی سیاست پر نکتہ چینی کی جو اس عظیم کارزار کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ فیض نے ان سے کہا۔

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن — تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کہیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن — رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اس دار و گیر کے زمانے میں بھی فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے آثار کے موضوع پر جو ادبی تخلیق ہوئی اس میں سے بھی بہترین ترقی پسند مصنفین کی ہی نگارش ہے اور اگر پائندگی حاصل ہے تو انہیں کی بعض نظموں اور انہیں کے لکھے ہوئے چند افسانوں اور مضامین کو۔ فیض کی وہ نظم جو اس مصرعے سے شروع ہوتی ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

کبھی بھلائی جا سکتی ہے؟ اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ جن حقائق کی حسین و نازک مصوری کی گئی ہے وہ ۱۴ اگست ۴۷ء کے بعد سے شروع ہونے والے پورے دور کی ماہیت کا فنکارانہ تعین کرتے ہیں۔

(روشنائی سے)

انور عظیم

# ماسکو کی ایک رات

برف گر رہی تھی اور ماسکو کی رات کو پر اسرار بنا رہی تھی۔ ہماری کار یوکرائنا ہوٹل سے نتاشا کے گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ سڑک پر تازہ تازہ سفید برف بچھی ہوئی تھی۔

نتاشا اور فیض پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نتاشا کے کٹے ہوئے گھنگھریالے تھے اور گردن پر جھول رہے تھے۔ وہ فیض کی شخصیت اور شاعری دونوں کے سحر میں کھو گئی تھی۔ فیض چند دن میں اپنے وطن واپس جانے والے تھے اور اب نتاشا انہیں اور ان کے دوستوں کو کھانا کھلانے اپنے گھر لے جا رہی تھی جہاں اس کا شوہر اور ماں مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔

نتاشا کے شوہر نے بڑی فراخدلی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ کھلانے "پلانے" میں اس نے روسی روایت کی پوری لاج رکھی۔ محفل رات گئے تک گرم رہی۔ نتاشا کا شوہر فلیش سے مہمانوں کی تصویریں لیتا رہا اور کہتا رہا، "یہ تصویریں اچھے ہندوستانی اور پاکستانی مہمانوں کی یاد تازہ ہو گی۔"

ہم نتاشا کے شوہر کی خوش اخلاقی اور شگفتگی پر حیران تھے۔ اس کی آنکھوں سے بڑی ذہانت اور شرافت ٹپک رہی تھی۔ نتاشا کا حسین چہرہ دمک رہا تھا اور مسرت حسین چہرے کو اور بھی حسین بنا دیتی ہے۔

جب ہم کافی پی کر ہوٹل کی طرف آئے تو ہم سب نتاشا کو چھیڑ رہے تھے۔

"برف گر رہی ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور تم ہمیں پہنچانے جا رہی ہو۔ تمہارا شوہر بڑا شریف ہے"

"میں تم لوگوں کو ہوٹل میں اتار کر سیدھی گھر واپس چلی جاؤں گی۔ اتنا انتظار تو وہ کر ہی لیگا،" نتاشا نے شرارت سے اپنے شوہر کے بارے میں کہا۔

فیض نے بات کاٹ دی اور اپنے نرم لہجے میں کہا۔

"نتاشا دیکھنا، تمہارا شوہر تمہیں قتل کر دے گا۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔"

فیض کی یہ بات بھی مذاق میں اُڑ گئی اور ہم سب کار سے اُتر گئے۔

چند دن بعد فیض پاکستان واپس چلے گئے۔ میں ماسکو ہی میں تھا۔ اس لئے نتاشا مجھے حیران کرتی رہتی، "بھئی فیض کی کچھ خبر ہے۔ روسی میں فیض کی نئی نظم کا ترجمہ ہوا ہے۔ بڑی خوبصورت ہے۔"

ٹیلیفون کے علاوہ بھی جب کبھی ملاقات ہوتی تو فیض کا ذکر ضرور کرتی اور کہتی —— میں نے اتنا اچھا آدمی نہیں دیکھا —— اسی لیے تو وہ اتنا اچھا شاعر ہے۔

لیکن کچھ دنوں بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو نتاشا کی ایک دوست نے عجیب خبر سنائی۔

"نہیں نہیں میں یقین نہیں کر سکتا۔" میرے منہ سے نکلا۔

رات، برف، آواز! یکایک فیض کی بات یاد آئی۔

"نتاشا! دیکھنا تمہارا شوہر تمہیں قتل کر دے گا۔"

اور واقعی نتاشا کے شوہر نے اپنی حسین بیوی کو قتل کر دیا تھا۔

فیض

# فنکار اور ترقّی پذیر مُعاشرہ

سب سے پہلے ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ ایک تخلیقی فنکار چاہے اور جو کچھ بھی ہو وہ ایک تاریک میں ڈھونگیا۔ ریاکار اور بزدل نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس پر جس حقیقت کا انکشاف ہو گا نہ تو وہ اسے سستے داموں بیچے گا اور نہ ہی کسی کے خوف سے اسے چھپائے گا۔ یہ حقیقت ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے اور اس کے فن کا آئینہ ہے۔ ہم اسوقت فنکار کی ذاتی اخلاقیات کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، (حالانکہ اس کی بھی اہمیت ہے) بلکہ اس اخلاقیات کا جو اس کے جمالیاتی اقدار کی اساس بنتی ہے۔

یہ حقیقت کیا ہے اور اس کی صحت کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے؟ ایک فنکار حیات کے تین ہم مرکز دائروں میں گھومتا ہے۔ پہلا دائرہ اس کی اپنی مادی اور موضوعی شخصیت کا ہے۔ دوسرا دائرہ اس کی برادری اور اس کی قوم کا ہے اور تیسرا دائرہ انسانیت کے اس دور کا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ وقت کے یہ تین ابعاد (DIMENSIONS) ماضی، حال اور مستقبل ہیں اور حیات کے یہ تین دائرے ہی وہ حقیقت ہے۔ جس کا وجود فنکار کے لئے اہمیت رکھتا ہے اور یہی اس کے لئے صداقت کا ماحصل ہے۔ یہ حقیقت اور صداقت فنکار اور اس کے ناظرین، قارئین اور سامعین سب کے سامنے جلوہ گر ہے لیکن فنکار اس حقیقت سے کس حد تک متاثر ہوا؟ اس کا پیمانہ یہی ہے کہ اس نے اس حقیقت اور صداقت کی عکاسی اپنے فن میں کس حد تک کی۔ حقیقت اور صداقت کا یہ ادراک اور احساس فنکار کے لئے کئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ کبھی اشیاء اور ان کے باہمی تعلق کی صورت میں داخل ہوتا ہے۔ کبھی تاریخ کے علت و معلول کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ کبھی عروج و زوال کی تفسیر بن کر نمودار ہوتا ہے۔ کبھی تصادم کی تصویر

دکھاتا ہے۔ کبھی ترکیب کی۔ کبھی خوش آہنگ کبھی بے آہنگ اور اسی طرح حقیقت کے اس فنکارانہ ادراک سے اشیاء اور ان کے باہمی تعلق کی قدر و قیمت بھی متعین ہو جاتی ہے۔

فنکار خود بھی اپنے گرد و پیش کے حقائق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس اثر کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ فنکار نے اپنے فن کے ذریعہ اپنے احساس حقیقت کو کس حد تک اپنے سامعین وغیرہ تک پہنچایا اس احساس کو فن کے ذریعے سامعین تک پہنچانے سے سامعین اثر قبول کرتے ہیں اور ان میں ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جب سامعین (قارئین یا عوام) میں ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں تو اپنے معاشرے اور سماج کے حقائق کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور رجحانات بھی بدل جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کے گرد و پیش کے سماجی حقائق سے ان کے رشتے میں بھی تبدیلیاں آجاتی ہیں اور معاشرتی حقائق اور انسان کے باہمی رشتوں میں تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کافی حد تک خود وہ حقیقت بھی بدل جاتی ہے جس کے احساس اور ادراک کو فنکار فن کے ذریعہ دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ جب بھی فن کا ایک شہ پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی حقیقت بھی وجود میں آجاتی ہے۔ ایک عظیم فن کار کی تخلیق کا اندازہ یہی ہے۔

صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فن کار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کی حدود میں اپنی ذات۔ اپنی قوم۔ اپنے عہد کے ماضی۔ حال اور مستقبل کو معلوم و محسوس کرے اور اس کے بعد اپنے علم اور احساس کی قدر و قیمت معین کرے اور اس کی تفسیر و تشہیر کرے۔

اس پس منظر میں ایشیاء اور افریقہ کے تخلیقی فنکار کے علم اور اس کی قدر و قیمت معین کرنے کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے؟ سب سے پہلے یہ کہ اسے ماضی سے باخبر ہونا چاہیئے۔ ماضی کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ محض اس قریبی ماضی سے باخبر ہو جس میں اس کا ملک سامراجیت اور نوآبادیت کی غلامی اور ذلت کا شکار رہا ہے۔ یہ دور قریب تر ہونے کی وجہ سے حال کے لئے اہم ہے۔ لیکن محض اس ماضی قریب ہی سے باخبر ہونا کافی نہیں۔ فنکار کو اس بہت پرانے ماضی سے بھی باخبر ہونا چاہیئے جس میں خون، دولت۔ سیاسی شان و شوکت سب ہی کچھ تھا اور پھر وہ بانسری اور ہل کا ماضی اور وہ مٹی اور پتھر کا ماضی بھی اور پھر حیات کے ابتدائی دور کا

وہ عہد عتیق جب زمین کے دوشیزہ جسم کو پہلی بار برہنہ کیا گیا تھا۔

اور پھر حال جس میں امیدیں بھی ہیں مایوسیاں بھی جس میں کامرانیاں بھی ہیں ناکامیاں بھی۔ توقعات بھی ہیں اور تلخ حقیقتوں کا سامنا بھی۔ جس میں نئی آبادیاں بھی ہیں اور نئے مظالم بھی۔

اور آخر میں مستقبل۔ ایک مستقبل جس کا احاطہ خود فنکار کے تصور نے کیا ہے۔ اگر فنکار کا تصور محدود ہے تو یہ زمین ایک چھوٹی کم حقیقت سی شئے ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن اگر تصور میں وسعت ہے تو یہی زمین پہنائے فطرت کے افقوں میں بھی نہ سما سکے گی۔ یہی کیفیت فنکار کی شخصیت کے تین دائروں کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فنکار اپنے حیاتی شعور کی حدود میں قید ہو اور اپنی مریض باطنی شخصیت کے درد کو بھلانے کی کوشش کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے محدود ماحول کے فوری تجربات کے حدود سے بلند ہو جائے۔

لیکن فنکار کا یہ تصور بھی اس وقت تک غیر حقیقی اور بے مایہ رہے گا۔ جب تک فنکار اس کا مطالعہ اس کے اصلی اسباب وعلل۔ عالمگیر معاشرتی محرکات۔ سامراجیت، نوآبادیت اور استحصال پسندی کے پس منظر میں نہ کرے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کاوش میں فنکاروں کی آخری منازل میں پہنچ جائے اور گردو پیش کے حقائق اور تضاد کو ایک آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھے اور اپنی ذاتی تکلیف کو اپنی قوم کے مصائب میں ضم کر دے اور قوم کے مصائب کو اس عہد کے مجموعی آلام و مصائب کے اس آفاقی تصور میں ضم کر دے جس میں مظالم بھی ہیں اور بغاوتیں بھی۔ طرح طرح کا جبر واستبداد بھی ہے اور انصاف کا خون بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ان جیرہ دستیوں کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد بھی جس میں کامرانیاں بھی ہیں اور ناکامیاں بھی۔

یہ آفاقی تصور ہی فنکار کو اپنے موجودہ عہد کی سطح سے ماورا لے جاتا ہے اور آخر کار ہماری کائنات کی مجموعی حقیقت اور ہمارے عہد کی مکمل صداقت سے روشناس کرا دیتا ہے۔

مغربی سرمایہ دار معاشروں میں برسر اقتدار جماعت نے کامیابی کے ساتھ فنکار کو اس کردار سے برگشتہ کر دیا ہے۔ ان ملکوں میں فنکار ایک تنہا فرد ہے اس کی کوئی جماعت نہیں اس کا کوئی مستقبل نہیں وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سوائے اپنی ذات یا ان لوگوں کے جو اس کا

"مال" خریدتے ہیں۔ ترقی پذیر معاشروں میں گذشتہ سامراجیت اور نوآبادیت کے اثر کی وجہ سے فنکار خود اپنی ذات اور اپنے ساتھیوں سے بہت دور ہوگیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاشروں کا فنکار ایسی زبان۔ ایسے الفاظ۔ ایسے محاوروں کی حیثیت رکھتا تھا جنہیں اس کے بیشتر عوام نہیں سمجھتے تھے۔ اس نے تصورات کی ایک ایسی دنیا بنالی تھی۔ جس کے لئے عام لوگ اجنبی تھے۔ یہ فنکار خود اپنے سے بیگانہ اس لئے ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو تنہا پایا اور اسے اس تلخی کا احساس ہوا کہ اس کے نالہ و فغاں کی آواز خود اس کی ذات کے ویرانے سے گونجتی ہے۔ اس لئے وہ بامعنی اور بامقصد فنی تخلیق کے راستے سے بھٹک گیا۔ اس نے اپنے اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے شعور کو گہرا اور وسیع کرنے کی کاوش چھوڑ دی اور اس کی توجہ دوسری نسبتاً کم اہم چیزوں کی طرف ہٹ گئی۔ اصل شئے کو سنوارنے کی بجائے اس کے سانچوں کی طرف توجہ دینے لگا۔ اعلیٰ خیالات کی تخلیق کی بجائے الفاظ اور آوازوں وغیرہ کو دلکش بنانے کی کوششوں اور مشقوں میں اپنے تخلیقی خواہش کی تسکین تلاش کرنے لگا۔ نیک اور بد۔ خیر اور شر۔ انصاف اور استبداد۔ خوبصورتی اور بدصورتی کے فرق کو بیان کرنا تو درکنار اسے اُن تصورات کے احساس سے بھی شرم آنے لگی۔

ترقی پذیر معاشروں کے اس دور میں تخلیقی فنکار کا یہ کردار نہیں ہوسکتا۔ عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ مطالبہ کریں کہ ان کا فنکار ان سے اس زبان میں باتیں کرے جسے وہ سمجھتے ہیں کم ازکم فن کے حدود میں وہ عوام کی جدوجہد۔ آلام و مصائب۔ غم و انبساط میں ان کا شریک رہے۔ ان میں سے بہت سے معاشرے بیسویں صدی میں پیدا ہوئے اور ابھی ابتدائی منازل طے کر رہے ہیں۔ یہ معاشرے جس نئے دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ سائنس اور صنعت کا دور ہے۔ اس دور میں نئے تصورات اور معاشرتی تعلقات میں مساوات کے نظریات نے جنم لیا ہے یہ نئے معاشرے فنکار سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس نئے دور میں ابتدائی منازل طے کرنے میں اپنے اپنے فن کے ذریعہ اپنے معاشرے کی مدد کرے یہ معاشرے توقع کرتے ہیں کہ فنکار نئی اور پرانی بے انصافیوں نئے اور پرانے مظالم اور استبداد اور ان تمام رجحانات کے خلاف جدوجہد میں معاشرے کی مدد کرے۔ جو زندگی، عزت نفس اور آزادی کی نفی کرتے ہیں اور یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ فنکار اس خوش آئند صبح کے تصور پر یقین رکھنے میں معاشرے کی مدد کرے جو جلد نمودار ہوگی۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے جدید فنکار کی روح بقول روسی شاعر نکراسوف کبھی غم اور انتقام کی آگ بھڑکائے اور کبھی امید و کامرانی کا پیغام دے۔

شاہد احمد دہلوی

# فیض صاحب

کوئی تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ دلی میں سجاد ظہیر ایک دفعہ آئے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی معرفت مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہوئے۔ کتاب "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکی تھی۔ یہ ساجھے کی ایک باؤلی ہنڈیا تھی جو ادب کے چوراہے پر پھوٹی تھی اس کے ایک ساتھی سجاد ظہیر بھی تھے اس لئے میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا اور سجاد ظہیر سے ملوایا۔ بہت ہوش مند آدمی نکلے۔ لندن میں کئی سال رہ کر واپس آئے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور بربار، ہنستے بھی تھے تو خندۂ دنداں نما سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین دلی میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اور اس انجمن کے مقاصد بیان کئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ مہربانی مجھے اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس وقت ساقی کا سورج چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے تو ٹھیک ہے۔ انجمن قائم ہو جائے گی۔" اور انجمن انصار ناصری اور فضل حق قریشی کی مدد سے قائم ہو گئی۔ دلی کے تقریباً سبھی بڑے ادیب، اُردو اور ہندی کے اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اور مضامین پڑھنے لگے۔ جلسے باری باری مختلف گھروں میں ہوتے تھے۔ کبھی میرے ہاں، کبھی ناصری صاحب کے ہاں، کبھی خیری صاحب کے ہاں اور کبھی جنندر کمار کے ہاں۔ ایک ایسا جلسہ چاندنی چوک میں نیل کے کٹہرے کے پہلو میں ڈاکٹر شوکت انصاری کے بالاخانے میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر انصاری کے بہت قریبی عزیز تھے اور انہی کی طرح گاڑھے کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ حالانکہ برسوں پیرس میں رہ کر آئے تھے۔ اس جلسے میں ایک طرف ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جن سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہماری انجمن کے دو ایک جلسوں کے بعد ہر جلسے میں دو ایک نئے آدمی آنے لگے تھے۔ پہلے

توہم انہیں ادیب یا شاعر ہی سمجھتے رہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سی، آئی، ڈی والے ہوتے ہیں اگلی دفعہ میں نے انہیں جلسے میں سے نکال دیا۔ اور ان کے محکمے کے افسر عبدالرحمٰن صاحب سے شکایت کی۔ وہ ایک ہی گرگ باراں دیدہ تھے۔ بولے "آپ کو روس سے کتنی رقم ملتی ہے؟" میں نے کہا "کچھ بھی نہیں"۔ بولے "تو پھر آپ ان کمیونسٹوں میں کیسے پھنس گئے؟" میں نے کہا "روس یا کمیونسٹوں سے اس انجمن کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ بولے۔ "آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں یا کوئی اور انجمن بنا لیں۔ ورنہ آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" میں نے گھر آکر سجاد ظہیر کو پوری روداد لکھی اور پوچھا کہ اگر کل کلاں کو میں قید ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟ جواب آیا۔ "ہم کسی قسم کی مدد نہیں کر سکیں گے"۔ ان کے اس خلوص سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے دلی کی انجمن فوراً بند کر دی اور اس کی بجائے "انجمن تہذیبِ ادب" قائم کر دی۔ جس نے اپنی پیش رو انجمن سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اور اس کے جلسوں میں سی آئی ڈی کے لوگ بھی نہیں آتے تھے۔

ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک اجنبی شخص نظر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جاکر پوچھا "یہ کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب کسی قدر حیران اور شرمندہ ہو کر بولے "آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیضؔ ہیں۔ اسلامیہ کالج امرتسر میں پروفیسر ہیں"۔ میں پھر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی چھپانے کے لئے خاموش ہو رہا۔ جلسہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔ مضامین پڑھے گئے۔ ان پر گفتگو ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ واہ واہ ہوئی۔ آخر میں جنابِ صدر نے فیض صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے از راہِ انکساری نہیں نکر کی۔ مگر جب انہوں نے اپنی ایک نظم سنائی تو ہم سب کے کان کھڑے ہوئے اور دیدے پھٹے کہ یہ پربین شاعر اب تک کہاں چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے ایک اور ایک اور کی آواز آنے لگیں۔ ہم سب ان کا کلام سن کر بہت خوش ہوئے اور وقتِ رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کی تعریف کی۔

یہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد، بلکہ تین چار سال بعد لاہور میں مشہور ادیب ایم۔ اسلم صاحب کے مکان پر

ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے ساتھ فیض صاحب سے دوسری ملاقات ہوئی۔ وہ کم گو آدمی ہیں اور مجھے بھی زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ لہٰذا سلام دعا اور مزاج پرسی سے آگے بات نہ چلی۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلم صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر تاثیر کی میم صاحب کے ساتھ جوان کی ایک بہن آئی تھیں۔ ان سے فیض صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔ لہٰذا تاثیر اور فیض اب ہم زلف ہو گئے ہیں۔

جب دوسری عالمگیر جنگ نے زور پکڑا تو یہ عجب کایا پلٹ ہوئی کہ ہمارے بعض ادیب جو فرنگی حکومت کے سخت مخالف تھے فوجی دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لئے ایک دم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے مجید ملک فوجی وردی پہنے نئی دلی میں دکھائی دیئے۔ مجھے تو جھٹکا سا لگا مگر وہاں آنجہ پر میل تک نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر تاثیر ایک فوجی دفتر کے ڈپٹی ڈائرکٹر بن کر گئے۔ انہیں دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہوا کیونکہ یہ تو کھدّر کا کرتا اور کھدّر کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب دکھائی دیئے کپتان کی وردی پہنے ہوئے حد یہ کہ کچھ دنوں بعد چراغ حسن حسرت بھی وردی پہنے ایک فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرنے لگے۔ ایک صاحب تھے عارف آل انڈیا ریڈیو میں، انہوں نے بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پہن لی، ایک اور صاحب تھے بدّر، وہ بھی وردی میں دکھائی دینے لگے۔ حد یہ کہ ن۔ م۔ راشد بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے وردی میں سب سے بھونگم حسرت مرحوم اپنے بے ڈول جسم اور فٹ بھر آگے چلنے والی توند کی وجہ سے لگتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے وردی کو نہیں بلکہ وردی نے انہیں پہن لیا ہے اور سب سے زیادہ افسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ شریف آدمی کیوں اس چکر میں پھنس گیا؟ اس وقت روایت یہ مشہور تھی کہ تاثیر نے فیض کو پھانسا ہے تاکہ وہ فخر سے یہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے خطِ غلامی نہیں لکھا مرحوم سے یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ:۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں۔

جنگ کے زمانے میں دلّی میں ادیبوں کی اچھی خاصی کھیپ آگئی تھی۔ احمد شاہ بخاری، پطرس، ریڈیو میں پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے اپنے گرد ادیبوں کا خاصہ بڑا حلقہ قائم کر لیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد، شوکت تھانوی، انصار ناصری، عشرت رحمانی، غلام عباس، محمود نظامی،

بہزاد لکھنوی تو جنگ سے پہلے ہی ریڈیو میں آ چکے تھے۔ جنگ کے زمانے میں چراغ حسن حسرت ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، منٹو، میرا جی، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، حامد علی خاں اور کرشن چندر بھی ریڈیو پر آ گئے۔ فوجی دفتروں میں مجید ملک، تاثیر، فیض اور بدر آ گئے تھے۔ سونگ پبلی سٹی میں حفیظ جالندھری تھے اور پولیٹکل میں حمید احمد خاں، پطرس کے اشارے پر ایک اونچے درجے کا ادبی حلقہ نئی دلی میں بنایا گیا اور اس کے جلسے کبھی پطرس کی کوٹھی پر اور کبھی تاثیر کے بنگلے پر ہونے لگے۔ مجھے بھی خبر نہیں کیوں یاد فرمایا جاتا تھا۔ پطرس اگر واقعی دل سے کسی کی عزت کرتے تھے۔ تو وہ پروفیسر مرزا محمد سعید تھے، جن سے انہوں نے ایک زمانے میں پڑھا تھا۔ ان کی بے اندازہ علمیت کے پطرس قائل تھے۔ اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حلقے کے پہلے جلسے میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ محمود نظامی نے "اُردو شاعری میں عورت" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور کوئی بات ایسی نکلی کہ اس پر پطرس نے مرزا صاحب دو چار لفظ بول کر خاموش ہو گئے۔ پطرس نے فیض صاحب کو اشارہ کیا اور خبر نہیں انہوں نے دانستہ یا نادانستہ آغاز کلام اس فقرے سے کیا "یہ تو مرزا صاحب آپ جانتے ہی ہیں کہ یونان کی تہذیب روا کی تہذیب سے قدیم تر ہے۔ اتنا سننا تھا کہ مرزا صاحب کو جلال آ گیا۔ چمک کر بولے" جی ہاں، میں جانتا ہوں اور اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں اور پھر جوان کے علم کے سمندر میں طوفان آیا ہے تو انہوں نے آدھ گھنٹے میں قدیم تاریخ کو کھنگال کر رکھ دیا۔ بخاری صاحب زیرِ لب مسکرا مسکرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پطرس نے چپکے سے میز پر چائے کا سامان منگوایا اور مرزا صاحب کا لکچر ختم ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ "آیئے حضرات چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔ فیض صاحب کی طرح ہم سب کو بھی مرزا صاحب کی تقریر میں مزہ آ گیا۔ اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پطرس جو عزت مرزا صاحب کی کرتے ہیں واقعی مرزا صاحب اس کے مستحق ہیں۔ اس ایک جلسے کے بعد مرزا صاحب پھر کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان جلسوں میں فیض صاحب کا کلام اکثر سننے میں آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ دلی کے ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت پطرس نے کی تھی۔ اس میں فیض صاحب نے "بر خاب سے جسم" والی نظم سنائی تھی۔ ایک صاحب جو میرے برابر بیٹھے ہوئے

تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ "برف سے جسم تو ہوتے تھے یہ برفاب سے جسم کیا ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جو برف جیسے نہیں بلکہ برف کے پانی جیسے ہوں۔" بولے "لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ جو لطف برفاب میں ہے وہ برف میں کہاں، ستر سال پہلے غالب بھی تو کہہ گئے ہیں۔
ثخس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟" کوئی تو بات ہے جو انہوں نے برف نہیں باندھا۔ برفاب باندھ گئے۔" ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

جنگ کا ہی زمانہ تھا کہ کرشن چندر ایک شام کو کتب خانۂ علم و ادب پر اردو بازار میں آئے۔ یہاں مغرب اور عشاء کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ جامع مسجد میں جب عشاء کی اذانیں ہونے لگیں۔ تو ہم سب اپنے اپنے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے کرشن چندر مجھے باتوں میں لگا کر ایڈورڈ پارک لے گئے اور بہت پس و پیش کے بعد بولے کہ "میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے شائع کریں گے؟" میں نے کہا۔ "ضرور شائع کروں گا۔" بولے۔ "تو کیا ممکن ہے کہ آپ مجھے اس کی قیمت ایک ہزار پیشگی دے دیں؟" میں نے کہا "روپیہ کب چاہیئے؟" بولے۔ "جب آپ دے سکیں۔ میں کشمیر جا کر ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔" اور واقع میں جب ایک مہینے بعد وہ کشمیر سے واپس آئے تو انہوں نے میرے گھر آ کر "شکست" کا مسودہ میرے حوالے کر دیا۔ ڈھائی مہینے بعد یہ ناول شائع ہو گیا اور اس کی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر تنقید لکھی، الٹا اثر ہوا کہ ناول کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب جسے دیکھئے وہ کہہ رہا ہے کہ میں بھی ناول لکھوں گا۔ اشک نے کہا "میں نے بھی ناول لکھنا شروع کر دیا ہے مگر میں پندرہ سو لوں گا۔" میں نے کہا۔ اگر شکست سے بہتر لکھو گے تو پندرہ سو ہی دوں گا۔" مگر وہ ناول نہیں لکھا گیا۔ عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" لکھنا شروع کر دیا۔ منٹو نے ایک ناول دھر گھسیٹا اور خود ہی اسے ناپسند بھی کر دیا۔ سنا کہ ڈاکٹر تاثیر ناول لکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ ان سے مل کر دریافت کیا تو کہنے لگے کہ "ارادہ تو ہے۔ مگر آپ فیض سے لکھوایئے۔" فیض صاحب سے ان کے فوجی دفتر میں ملا، بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بولے۔ "چھ سو روپے پیشگی دید یجئے۔" میں نے چیک وہیں ان کے حوالے کیا۔ حسرت صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے "مولانا، یہ آپ نے کیا ناول شائع کیا ہے؟" میں نے کہا "آپ لکھیے نا" بولے "دو سو روپے پیشگی دے جایئے" ان کی خدمت میں بھی چیک پیش

کر دیا۔ دو تین مہینے بعد فیض صاحب نے روپیہ واپس کر دیا کہ ناول نہیں لکھا گیا۔ حسرت صاحب نے نہ ناول دیا اور نہ روپے واپس کئے۔ بلکہ ان روپوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہیں کیا۔ اور میں نے بھی انہیں اس خوف سے یاد دلانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ سچ مچ ناول لکھ ہی دیں۔ فیض صاحب کی تنہا مثال ہے کہ انہوں نے روپیہ واپس کر دیا ورنہ کم و بیش پندرہ ہزار روپیہ انہی پیشگیوں میں ڈوبا اور پاکستان آنے کے بعد تو میں نے پبلشنگ کے کام سے توبہ ہی کر لی۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

فوجی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فیض صاحب "امروز" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ چراغ حسن حسرت بھی اسی دفتر میں آ گئے تھے۔ ان حضرات نے اس اخبار کو چار چاند لگا دیئے۔ عام اخباروں سے اس کی نمود مختلف تھی۔ خبروں کے علاوہ اس کا ادبی حصہ بھی بڑا جاندار ہوتا تھا۔ یہ اخبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ جہاں تک کہ سب اُردو کے اخباروں سے بازی لے گیا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی تھے۔ اُردو کے مضامین تو فیض صاحب کے لکھے ہوئے شاذ ہی دیکھنے میں آئے۔ البتہ انگریزی کے مضامین کئی دفعہ دیکھنے میں آئے۔ بہت سلجھے ہوئے اور پُر مغز ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ فیض صاحب نے نثر لکھنے کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور اپنی تمام اعلیٰ قابلیت کے باوجود اب تک کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کر سکے اور مجھے انجیل مقدس کا وہ قصہ یاد آتا ہے کہ ایک آقا جب سفر پر جانے لگا تو اپنے تین غلاموں کو ایک ایک سونے کا سکہ دے گیا۔ ایک غلام نے اسے خرچ کر ڈالا۔ دوسرے نے اسے زمین میں گاڑ دیا اور تیسرے نے اسے کاروبار میں لگا دیا۔ آقا نے سفر سے واپس آ کر پوچھا کہ تم سکے کا کیا کیا؟ پہلے غلام نے کہا "میں نے اسے خرچ کر دیا۔" آقا اس پر بہت بگڑا اور اسے سزا دی۔ دوسرے نے کہا "میں نے اسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ یہ لیجئے یہ موجود ہے۔" آقا اس سے بھی ناخوش ہوا اور بولا کہ تم نے اسے ضائع نہیں کیا مگر تم نے اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ یہ تم نے بہت بُرا کیا۔ تیسرے نے سکہ بھی پیش کر دیا اور وہ منافع بھی جو کاروبار میں اسے لگانے سے حاصل ہوا تھا۔ آقا اس سے بہت خوش ہوا۔ اس کی ستائش کی اور اسے انعام بھی دیا۔ کاش فیض صاحب بھی اپنے ٹیلنٹ کو بروئے کار لاتے اور دوسروں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیتے۔ سنا ہے کہ ان کا ایک چھوٹا سا مجموعہ

چند مضامین کا کبھی ہوا تھا۔ اب تو وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا اور اکثر لوگوں کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کی ادارت بھی فیض صاحب ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک بڑا شاندار ہفتہ وار پرچہ "لیل و نہار" بھی امروز اور پاکستان ٹائمز کے ادارے سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی مقرر کیے گئے تھے مگر ان کا نام شاید برائے نام ہی دیدیا گیا تھا۔ "لیل و نہار" میں نہ تو فیض صاحب بالالتزام کچھ لکھتے تھے اور نہ انہیں اس پرچے کے دفتر میں کبھی کام کرتے دیکھا۔ ایک اور معروف ادیب و صحافی تھے۔ سبطِ حسن یہی اس پرچے کا سارا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سبطِ حسن کو علیحدہ کر دیا گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کیمونسٹ مشہور ہو گئے تھے۔ "لیل و نہار" جس تیزی سے بڑھا تھا۔ ان کی علیحدگی کے بعد اسی تیزی سے گرنا شروع ہو گیا — پروفیسر صوفی تبسم نے اسے بہت سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن صوفی صاحب کا عہد "لیل و نہار" کا سنبھالا ہی ثابت ہوا اور ایک لائقِ فخر ہفتہ وار جریدہ موت کی آغوش میں جا سویا۔

کیمونسٹ تو فیض صاحب بھی مشہور ہو گئے تھے۔ مگر ان کی تخریبی سرگرمیاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ وہ تو ایک خاموش اور مرنجانِ مرنج قسم کے آدمی تھے اور ہیں۔ مگر کیمونسٹ ہونے کا کلنک کا ٹیکا اگر ایک دفعہ کسی کے لگ جائے تو شاید پھر ساری عمر چھٹائے نہیں چھوٹتا۔ غالباً اسی "داغ بدنامی" کی وجہ سے فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" سے، احمد ندیم قاسمی "امروز" سے اور سبطِ حسن "لیل و نہار" سے علیحدہ کر دیئے گئے۔

جب راولپنڈی کانسپریسی کیس میں بعض بڑے فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے تو میری طرح بے شمار لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ شریف آدمی اس زنغے میں کیسے آگیا؟ یہ کوئی بہت اونچے درجے کی سیاست ہے۔ جسے معمولی عقل کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لہذا ہم نے ؏

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

کہہ کر صبر کر لیا۔ غالباً تین ساڑھے تین سال فیض صاحب قید و بند میں رہے اس زمانہ میں انکی بیگم نے مردانہ وار ابتر حالات کا مقابلہ کیا۔ ملازمت کی اور اپنی بچیوں کے معیارِ زندگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان کی تعلیم بھی جاری رہی۔ اور ان کے اجلے خرچ بھی چلتے رہے۔ میں نے بیگم فیض کو اخبار کے دفتر میں پسینے میں شرابور نہایت انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت

نہیں تھی کہ میں ان کے قریب جاکر انہیں اس حوصلے کی داد دیتا۔ دور سے انہیں دیکھا اور بھاری قدموں کے ساتھ چلا آیا۔ بارے یہ ابتلا کا دور بھی ختم ہوگیا اور فیض صاحب بری ہوکر اپنے گھر آگئے۔ ان کے جیل میں رہنے کا ایک فائدہ فیض صاحب کو ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ہمیں یہ ہوا کہ ان کی منظومات کے دو مجموعے "زنداں نامہ" اور "دست صبا" ہمیں مل گئے۔

بے روزگاری کے زمانے میں فیض صاحب نے ایک فلم کے مکالمے وغیرہ لکھے تھے اور اس پر بین الاقوامی انعام ملا تھا۔ مگر فلم سازی اور فلم بازی سے کسی بھلے آدمی کو کیا سروکار؟ فیض صاحب دراصل تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ مگر کسی یونیورسٹی نے کوئی پیش کش نہیں کی۔ شاید اہلِ اختیار انکے کلنک کے ٹیکے سے ڈرتے تھے۔ بارے جب لاہور میں آرٹس کاؤنسل کی شاخ قائم ہوئی تو فیض صاحب اس کے سیکرٹری مقرر ہوگئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں لینن پرائز دیے جانے کا اعلان روس نے کیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب پاسٹرناک کو اس کتاب ڈاکٹر ژیواگو پر نوبل پرائز دیے جانے کا اعلان ہوا تھا، اور حکومتِ روس نے اس بوڑھے مصنف کی اور کتے سے بدتر کر دی تھی۔ اب اسی کمیونزم کے منبع سے فیض صاحب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا! سب نے دم سادھ لیا کہ اللہ خیر کرے۔ دیکھیے اب کیا گل کھلتا ہے؟ مگر حکومتِ پاکستان نے اس غیر ملکی اعزاز پر روس کی طرح تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شکر ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ جب فیض صاحب انعام لینے کے لئے روس جانے لگے تو کراچی ٹھہرتے ہوئے گئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے آرٹ کونسل میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا اس جلسے کی صدارت کا فخر مجھے حاصل ہوا۔ منجملہ اور باتوں کے میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنی حکومت سے شکوہ کیا کہ فیض صاحب کو اپنی حکومت سے اب تک کوئی انعام نہیں ملا اور سات سمندر پار کے ایک بہت بڑے ملک نے انہیں امن کے اتنے بڑے انعام کا مستحق سمجھا۔ شاید ہمارے ملک میں زندہ ادیبوں کی قدر دانی کا دستور نہیں ہے۔ جبھی تو پاکستان کا سب سے ہردلعزیز شاعر محروم التفات ہے۔

جب فیض صاحب روس روانہ ہوگئے تو یہاں افواہ اڑنی شروع ہوگئی کہ واپس آتے ہی گرفتار ہوجائیں گے۔ مگر ایسا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا اور فیض صاحب شاد و بامراد واپس آگئے۔

روس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد سنا کہ فیض صاحب لندن چلے گئے ہیں اور پاکستانی کلچر پر مواد جمع کر کے کتاب لکھیں گے۔ خاصے طویل عرصے تک وہ لندن میں رہے اور یہاں واپس آ کر بھی انہیں خاصی مدت ہو گئی مگر وہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شاید ان کی شاعرانہ سہل انگاری مانع ہے

سال ڈیڑھ سال پہلے سنا تھا کہ فیض صاحب کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے صدر شعبہ بنائے جا رہے ہیں۔ اس خبر سے خوشی ہوئی تھی کہ یہ جگہ ان کے لئے موزوں بھی تھی اور خود بھی یونیورسٹی کے لئے بھی لائقِ فخر، مگر پروفیسر احمد علی کی طرح فیض صاحب کو بھی اربابِ وکشاد نے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جو جوہر قابل ہوتے ہیں انہیں قدرداں مل ہی جاتے ہیں۔ اب وہ ایک بہت بڑے مشاہرے پر ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ فیض صاحب تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ پھر تعلیمی سلسلے ہی میں آ گئے۔ حق بہ حق دار رسید،

علی سردار جعفری

# لکھنؤ کی ایک رات

دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں کی بہار

وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کا مہینہ تھا اور سرد ہوا کا جھکڑ چل رہا تھا۔ قندھاری لین میں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا ہوا اِملی کا پرانا تناور درخت کسی عظیم اور قد آور دیو کی طرح جھوم رہا تھا۔ اُس کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں۔ اور سائیں سائیں کی مسلسل آوازوں کے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پتیاں برسنے لگتی تھیں۔ ہوا ہزاروں پروں سے پرواز کر رہی تھی۔ سڑکوں کی بجلی کی بعض روشنیاں جو کھمبوں کے بجائے تاروں سے لٹکی ہوئی تھیں، لمبی لمبی پینگیں لے رہی تھیں اور سائے دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ خود ہمارے سائے بھی کبھی پیچھے اور کبھی آگے آکر ناچنے لگتے رات اپنے شباب پر تھی اور ہمارے دلوں میں ایک احساس فتح مندی تھا۔ ہم آل انڈیا ریڈیو سے نووارد شعراء کا مشاعرہ پڑھ کر واپس آرہے تھے۔

نووارد شعراء کا مشاعرہ منتظم تھے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر سومناتھ چپ معشوقِ عاشق پیشہ، صدارت کے فرائض شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی نے انجام دیئے۔ آج خود اُنکے نظم سُنانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا وہ نوعمر ترقی پسند شاعروں کا کلام سننے آئے تھے۔ وجیہہ اور سُرخ و سپید رنگ، دل نواز اور معصوم تبسم، آنکھوں میں شفقت، محبت اور غرور باقی سارے انداز میں ایک باوقار رندی

جوشؔ کی بحث صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوشؔ تو قبلۂ زندانِ جہاں ہے ساقی

مشاعرہ سننے والے لکھنؤ کے صاحبانِ ذوق، وہ بھی جو نئی شاعری کے پرستار تھے اور وہ بھی جن کے ماتھے پر بل پڑے رہتے تھے۔ آج وہ بھی دیکھنے آئے تھے کہ نووارد شعراء پر کیا بیتی ہے

انہیں کے ہجوم میں سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانی اور میر کارواں، ابھی نوعمر ہیں۔ انگلستان سے تعلیم ختم کر کے واپس آئے ہیں۔ جیل میں رہ چکے ہیں، بیماری کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے ہیں، لیکن چہرے پر طالب علمی کی معصومیت باقی ہے۔ بھاری بھر کم جسم ہے۔ بہت نازک ہاتھ ہیں، شخصیت میں مٹھاس ہے، رضیہ ان کی بیوی ہیں، گندمی رنگ، چھریرا جسم، الٰہ آباد یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا ہے۔ مایا سرکار مہیلا ودیالے میں انگریزی پڑھاتی ہیں، بنگالی ہیں، لیکن لکھنؤ کی نفیس اُردو بولتی ہیں۔

پروفیسر ڈی پی مکرجی بنگالی زبان کے مستند ادیب اور نقاد، موسیقی کے پرستار، شعر و شاعری کے دلدادہ، انتہائی ترقی پسند، لکھنؤ یونیورسٹی میں معاشیات اور سماجیات کی تعلیم دیتے ہیں، بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں، نفیس بنگالی دھوتی اور کرتا پہن رکھا ہے۔ کندھوں پر ایک کشمیری شال ہے، ہونہار طالب علموں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے گھر پر بلا کر چائے پلاتے ہیں۔ اپنی باتوں سے محفوظ کرتے ہیں اور کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے ہیں اُردو کم سمجھتے ہیں لیکن بلا کی ذہانت ہے، اچھے اور بُرے شعر میں تمیز کر لیتے ہیں۔ اُنہیں خوشی ہے کہ نووارد شعراء میں اُن کی یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی ہے۔ احمد علی، جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے ہیں اُردو میں چند افسانے لکھے ہیں، اور انگریزی میں ناول جس پر فاسٹر کا دیباچہ ہے، بڑے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔

گوہر سلطان جس کے گلے کی دھوم ہے۔ حیات اللہ انصاری، اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور "ہندوستان" ہفتہ وار کے ایڈیٹر، نئے شاعروں کی طرف دار لیکن ناقدانہ انداز لئے ہوئے۔ انور جمال قدوائی اپنے مخصوص بہکے ہوئے انداز کے ساتھ سیاست میں عملی دلچسپی نہیں لیتے، ادب کی تخلیق نہیں کرتے لیکن نظریاتی اور جذباتی طور سے دونوں کے معاملے میں انتہائی انقلابی اور سبطِ حسن سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو جادو کے محلوں اور بارہ دریوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگا لاتے ہیں، حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان، شاعر ان کے دوست نہیں دربار ہی ہیں۔

ان سب کے علاوہ یونیورسٹی کے اور بھی اساتذہ اور طالب علم اور لکھنؤ کے قدیم اساتذہ

جامہ وار کی شیروانیاں پہن کر آئے ہیں اور دو زانو بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے اُردو ادب کی تاریخ میں کبھی بزرگ اور معمر شعراء نوعمر شاعروں کا کلام سننے نہیں آئے تھے۔

سب ہمہ تن انتظار ہیں کہ نووارد شعراء سومناتھ چپ کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ اس عہد کے باغی ہیں، سرپھرے عیش و نشاط کے دلدادہ مگر کفن بردوش، یہ ابھی عظیم نہیں ہیں، لیکن ان کے نام افسانے بن چکے ہیں، اُردو شعر و ادب کے سنئے دھارے اب ان کے نام پر بہیں گے۔ یہ نیا جذبہ، نیا احساس، نئی زبان لے کر آئے ہیں۔ ماضی کا سارا ورثہ ان کے پاس ہے۔ جدید تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ اس لیے قدیم اور جدید کا امتزاج ان کے یہاں خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ یہ پرانے ہیروں کی نئی طرح تراش رہے ہیں۔ ہجر و وصال کی داستانیں ان کو آتی ہیں، محبوب کے وعدۂ فردا کی لذت سے واقف ہیں، لیکن ہندوستان کی آزادی اُن کی سب سے بڑی محبوبہ ہے اور اس محبوبہ کے سامنے نئی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کی گردن بھی جھک جاتی ہے

نووارد شعراء کی طرف بے شمار نگاہیں اٹھتی ہیں، نگاہیں جن میں محبت کی گرمی ہے۔ نگاہیں جن میں سرد مہری ہے۔ عاشقانہ نگاہیں، رقیبانہ نگاہیں، لیکن ہر نگاہ میں ایک سوال ہے۔

کون کون ہے؟

یہ مجاز ہے، خوش پوش مگر چاک گریبان، آنکھوں کی گہری اُداسی میں شوخی کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ اس کے باریک ہونٹوں کی نرم مگر شریر مُسکراہٹ کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔ اُس کے گلے اور شعر میں بقول فیض کے مغنی کے نغمے کا وفور ہے۔ جوش نے اُس کی شخصیت کو ایک فقرے میں سمیٹ لیا ہے " وہ ایک نگاہ میں دنیا کے سارے حُسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جانا چاہتا ہے" ۔

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اور یہ فیض احمد فیض ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی تخلیق، چہرے کی مسکراہٹ اُداس ہے، لیکن آنکھیں نرم اور محبت بھری آواز میں ہلکا سا گداز اور شعروں میں دل کی دھیمی دھیمی آنچ جو لفظوں کے سنگیت کو پگھلا کر رنگ بنا دیتی ہے اور ہر مصرع ایک پینٹنگ بن جاتا ہے ایک

حسین وجمیل تصویر جو دل میں آویزاں ہو جاتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نرم روشنوں کے اندر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، مگر یہ وہ بجلیاں ہیں جو صرف فیض ننھے ننھے شراروں سے بنا سکتا ہے ؎

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

اور یہ جذبی ہے۔ سب سے بے نیاز اور سب سے الجھا ہوا احساس چہرے پر عمر بھر کے مصائب اور مفلسی کی تلخی، آنکھوں میں محبت کی بے پناہ بھوک اور حسین ترنم میں ایک دل دوز کیفیت جس کو اُس کی آواز کی رچی ہوئی سرشاری بھی نہیں چھپا سکتی۔ کسی کا احساس اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ زندگی کو بھی دھتکارتا ہے اور موت کو بھی ؎

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

اور یہ مخدوم محی الدین ہے۔ حیدرآباد کا انقلابی سنگِ اسود سے تراشا ہوا آبنوسی چہرہ، بلند پیشانی، شگفتہ آنکھیں، مسکراہٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد، ترنم بے پناہ ہے جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور رومان کے دوراہے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
پتیاں کھڑکیں تو میں سمجھا کہ آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو وہ پا ہی گئے
آ گئی تھی دِلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی

اور یہ جاں نثار اختر ہے، نووارد شعراء کے ہجوم میں تنہا جسے شاعری اپنے والد مضطر خیر آبادی سے ورثہ میں ملی ہے۔ اپنے آپ سے الجھا ہوا، خود ہی سنجیدہ ہو جاتا ہے اور خود ہی مسکراتا ہے ؎

آسمان جیسے جلے لاشے کی دھول
چاند جیسے ایک بے اُمت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور یہ سردار جعفری ہے۔ کرشن چندر کا یہ کہنا ہے کہ "اس کے چہرے پر ہنسئے ہتھوڑے کا نشان ہے۔" پروفیسر محمد مجیب کی رائے ہے کہ وہ رنگین تصویریں نہیں بناتا، بلکہ پتھروں سے بُت تراشتا ہے ؎

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسّم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیر اُفق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانی افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نووارد شعراء کے اس مشاعرے میں ن۔م۔ راشد کے بھی آنے کی خبر تھی جس کے سر اُردو شاعری میں آزاد نظم کا سہرا ہے۔ پطرس کے نزدیک وہ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان راشد کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جب ہم آدھی رات کو گھر واپس پہنچے تو آندھی اور طوفان کا زور بڑھ گیا تھا۔ سردی بھی بلا کی تھی۔

گھر میں فرنیچر کے نام پر ایک میز، بید کی چند کرسیاں اور مونج کے تین پلنگ تھے۔ اُنہیں کنارے سرکا کر زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اُس کے اوپر کارنس تھی۔ اور کارنس کے اُوپر دیوار پر اسپین کی ایک مجاہد خاتون کی بڑی تصویر لگی تھی۔ اُس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ سینہ ابھرا ہوا تھا۔ جس کی دوشیزگی کو فوجی لباس بھی نہیں چھپا

سکتا تھا، چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ شدت جذبات سے اینٹھے ہوئے تھے اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "TO DEATH" دو اوندھی بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی میں وہ تصویر اور بھی زیادہ پُرحوصلہ اور دل آویز معلوم ہو رہی تھی۔ کارلنس کا سایہ تصویر کے ابھرے ہوئے سینے تک پہنچتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پُرجوش شکل موت کے اندھیرے سے زندگی کا پیغام لے کر اُبھر رہی ہے۔ ایک طرح وہ تصویر ہمارے رومانی اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھی۔ ہم بھی موت سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے۔ اسپین ہمیں اپنا ملک معلوم ہوتا تھا۔ کیوں کر وہ فاشزم کے خلاف آزادی اور انسانیت کے حسین خوابوں کے لئے لڑ رہا تھا۔ اسپین کی آزادی تھی اور وہ مجاہد خاتون آج کی رات ہماری محفل میں شریک تھی اور ہندوستان کی آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی ع

"کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

کمرے میں سکون تھا، آگ اور دلوں کی حرارت تھی، کبھی کبھی باہر چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے ہزاروں ہاتھوں سے ہمارے دروازے کو جھنجھوڑ دیتی تھیں اور کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بالٹیوں پر جلتی ہوئی شمعوں کی لوئیں تھرتھرا جاتی تھیں۔ ہم بالٹیوں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی نرم روشنی میں ایک دوسرے کے جذبات اور محبت سے بھرے چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ جوش ملیح آبادی زیادہ دیر تک قبلہ زندانِ جہاں کے فرائض انجام نہ دے سکے۔ رات کے جاگنے کے معاملے میں وہ ہمیشہ کچے ہیں۔ اس لئے جب جماہیوں نے انہیں زیادہ ستایا تو وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ رات کو جاگنا اُلو کی خاصیت ہے۔

محفل کی گرمی بڑھتی گئی۔ دلوں کا سرور بڑھتا گیا۔ چہرے زیادہ روشن ہوتے گئے۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ شاعری کا دور ہے یا جاموں کی گردش۔ سب ہم عصر تھے، سب نووارد تھے، سب ایک حلقے میں بیٹھے تھے۔ سب کا الگ الگ انداز تھا۔ انفرادیت پہچانی جاتی تھی۔ کسی قسم کے رشک، حسد یا معاصرانہ چشمک کا پتہ نہیں تھا۔ ایک دوسرے کی تعریفیں اس طرح ہو رہی تھیں جیسے عاشق معشوق سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

فیض نے کہا: "بھئی لاہور میں ایک بہت اچھا شعر سنا تھا معلوم نہیں کس کا ہے، ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی کا اداس چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ جذبی کا شعر تھا جو اس سے پہلے لاہور پہنچ کر مشہور ہو چکا تھا۔ فیض اور جذبی گلے ملے۔

ابھی فیض کو بیٹھنے کی بھی مہلت نہیں ملی کہ جذبی نے بغیر کسی تمہید کے فیض کی نظم "موضوع سخن" کو اپنے بے پناہ اور انتہائی دلگداز ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، جو ہم نے چند ماہ قبل "نیا ادب" میں شائع کی تھی ۔

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہات

باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، اور اندر جذبی کا ترنم طوفان برپا کر رہا تھا۔ فیض کے چہرے پر ایک معصوم اور تشکر آمیز مسکراہٹ تھی ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر داد اور کیا ہو سکتی تھی۔

جذبی نے پہلا بند پڑھا تھا کہ مجاز نے دوسرا بند اٹھا لیا اور اپنا راگ چھیڑ دیا ۔

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگین
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

اب دونوں نے باری باری ایک ایک بند گا کر نظم مکمل کی۔

جذبی کے ترنم کا تار ٹوٹنے نہیں پایا تھا کہ مخدوم کا راگ بند ہوا اس کے ہاتھ میں دیوان حافظ تھا جس کی ایک غزل وہ گنگنا رہا تھا ۔

شاہِ شمشاد قداں، خسرو شیریں دہناں
کہ بہ مژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں

برجہاں تکیۂ مکن گر قدحے می داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خورد نازک بدناں

اس غزل نے محفل کو اور ہی رنگ دے دیا۔ زہرہ جبینوں اور نازک بدنوں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا اور اب مخدوم کی آواز تنہا نہیں تھی۔ سُریلی اور بے سُری سب آوازیں مل گئیں۔ حافظ کی غزل کا کورس دیر تک جاری رہا۔ دیوار پر اسپین کی مجاہد خاتون موت کی دعوت دیتی رہی۔ باہر ہوائیں دیوانہ وار دروازے کو کھٹکھٹاتی رہیں مگر ہم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرازی کے لفظوں میں حسینوں کے جامِ صحت پیتے رہے۔ نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین جھانک رہا تھا۔

یہ طوفان تھما ہی تھا کہ جذبی پھر اُٹھ کھڑا ہو گیا، اب ناچ ناچ کر "موضوعِ سخن" کو گانے لگا۔

آج پھر حُسنِ دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلیں ہاتھوں پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

اس کی آواز میں خفگی پیدا ہو گئی تھی، اس لئے اور بھی دِل دوز ہو گئی تھی، اب وہ ایک ایک لفظ کو اتنا کھینچ کر گا رہا تھا کہ سانس کا تار ٹوٹ جاتا تھا۔

ہم نے بمشکل پکڑ کر اُسے بٹھایا، لیکن وہ تڑپ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ فیض کی "موضوعِ سخن" پھر محفل پر چھا گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جذبی کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا پھر بھی وہ نظم سُنانے پر اصرار کر رہا تھا۔

اب تک فیض کی ایک ہی نظم اور وہ بھی جذبی کی زبان سے اتنی بار سُنی جا چکی تھی کہ سب لوگ تھک گئے تھے۔ اس لئے کسی نے خیال کو دوسری طرف موڑنے کے لئے جذبی سے اس کی نئی نظم "موت" کی فرمائش کر دی اور جذبی کی ٹوٹی ہوئی آواز اور تھکے ہوئے ترنم نے اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ۔

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تند چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

ایسا لگ رہا تھا جیسے گذرتی ہوئی رات کے ساتھ جو آندھیوں کی رفتار سے صبح کی طرف جارہی تھی، جذبی سفر کر رہا ہے۔ نجانے کتنی بار اس نے یہ نغمہ سنایا۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب صبح ہوتے ہوتے آندھیاں تھم گیئں اور بالٹیوں پہ جلتی ہوئی موم بتیاں چھوٹے چھوٹے سکوں میں تبدیل ہو گیئں اور ان کی تھرتھراتی ہوئی لویں دم توڑنے لگیں اور کھانے کے لئے دسترخوان بچھا، تو جذبی بیچ دسترخوان پر کھڑا ہوا گا رہا تھا ؎

اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھاؤں تو چلوں

آدھی سے زیادہ محفل سو رہی تھی اور جذبی کی ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ مخدوم کا اداس ترنم سنائی دے رہا تھا، جو صرف اپنے لئے گنگنا رہا تھا ؎

خلوتِ رنگین میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

ایک اور رات ختم ہو گئی، جو پھر کبھی نہیں آئے گی۔ ایک اور دن شروع ہو گیا۔ اور دیوار پر لگی ہوئی اسپین کی مجاہد خاتون کی تصویر ہمیں زندگی کی جدوجہد کی طرف چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔

حمید اختر

# فیض ــ شخصیّت کی چند جھلکیاں

فیض کے متعلق گفتگو کے دوران، ایک دفعہ ایک نامور مغنیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ "میں فیض پر مرتی ہوں، لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ وہ میرے کیا لگتے ہیں، میں انہیں اپنا معشوق سمجھوں یا عاشق باپ تصور کروں یا بیٹا یا شوہر۔ یہ فیصلہ کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ بہرحال میں کو اتنا چاہتی ہوں اتنا چاہتی ہوں کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

فیض کی شخصیت (بلکہ محبوبیت) پر اس سے بہتر تبصرہ شاید ممکن نہیں ہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا میرا کام نہیں ہے مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فیض کی زندگی اور شخصیت پیار اور محبت کی ہر معصوم شکل کا مجموعہ ہے۔ ہمارے ایک مرحوم دوست نے جن کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ میں ہر شام فیض کو گھیر کر ان کے گھر لے جاؤں، ایک دفعہ بھر مجلس میں یہ اعلان کر کے پوری محفل کو حیرت میں ڈال دیا کہ فیض کا کلام ان کی سمجھ میں نہیں آتا مگر وہ فیض کے عاشق ہیں۔ یہ دوست زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مگر یاروں کے یار تھے۔ فیض کو مرحوم کی یہی ادا پسند تھی، یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ بیگم فیض نے ان کے گھر جانے سے محض اس لئے انکار کیا کہ ان کی نظر میں یہ دوست بڑے بور تھے تو فیض تلملا اٹھے۔ یہاں بوروں کے بارے میں موصوف کے اس مقدمے کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ "کوئی بور ہرگز قابل برداشت نہیں ہے۔" ماسوا اس بور کے جو آپ کا دوست ہے۔

دوستی محبت اور خلوص کا یہی سرچشمہ اگر نامور فنکاروں، دانشوروں اور ان پڑھ لوگوں تک کی محبت کا مرکز ہے تو اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ فیض کے دوستوں میں اہلِ علم، کم علم بلکہ بے علم لوگ بھی بڑی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ وہ محکمے بھی جن کا کام ایسے لوگوں کی نگرانی کرنا ہے۔ دوستوں اور ہمدردوں سے بھرے پڑے ہیں، ان کے دوستوں میں فلم آرٹسٹ

گانے والے، ادیب، شاعر، طلباء سرکاری محکموں کے ملازم، فوج اور پولیس بلکہ خفیہ پولیس کے افسر۔ غرض کہ ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے لوگوں نے فیض کو پڑھا کم ہے ان سے محبت زیادہ کی ہے۔ وہ بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے شعراء کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور جدید شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے لیکن بحیثیت انسان کے وہ اس شاعر سے بھی بڑے ہیں جس میں سے لوگ صرف اس کے کلام کے واسطے سے ملتے ہیں۔ وہ اگر شعر نہ کہتے تب بھی اتنے ہی بڑے آدمی ہوتے دوستوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے میں ان کا ثانی مشکل ہی سے ملے گا۔

لوگوں کو دھوکہ دینے والے پیشہ وروں کے لئے صلائے عام ہے کہ وہ فیض کے پاس پہنچیں کیونکہ وہ ان کو پہچان کر بھی دھوکہ کھا جائیں گے اور بعد میں معاف کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کے پاس تمتماتا ہوا چہرہ اور کھولتا ہوا خون لے کر جائیں گے اور کسی بدطینت اور ذلیل دشمن کے مکروہ کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد ہمدردی کے طالب ہوں گے تو آپ کو مایوسی ہو گی کیونکہ آپ کی المناک داستان سُن کر سب سے پہلے تو وہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لگائیں گے پھر ایک لمبی سی ہوں کی آواز آئے گی اور اگر آپ اس کے بعد بھی اس بارے میں ان کی رائے معلوم کرنے پر مصر ہوں گے تو آپ کو "چلو چھوڑو" کے سوا کچھ سننے کو نہیں ملے گا۔

یہ بات نہیں ہے کہ فیض کو غصہ نہیں آتا۔ غصہ ان کو بھی دوسرے خاکی انسانوں کی طرح آتا ہے مگر غصہ ضبط کرنے میں انہیں جو کمال حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کی قسمت ہے، ہم نے بڑے بڑے بدباطنوں کی خباثتوں کا مظاہرہ بھی دیکھا ہے۔ جنہوں نے فیض پر کیچڑ اچھالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر آخر میں منہ کی کھا گئے۔ تین برس پہلے جب ان پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا تو اکثر دوستوں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ اس غیر معمولی ضبط و تحمل کا نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے۔ یہ اندازہ صحیح ہو لیکن حساس آدمی کے لئے اپنے بارے میں غلط الزام سن کر خاموش رہنا بھی بڑا مشکل کام ہے اور فیض یہ کام بڑی مدت سے کر رہے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ ہمارے معاشرے میں بڑے سے بڑے محب وطن دانشور اور محبوب ترین افراد بھی مفاد پرستوں، غرض مندوں اور کرائے کے ٹٹوؤں کے حملوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا، ان کے مخالفوں میں طرح طرح کے لوگ شامل ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک مشہور صحافی نے جو ابتداً ایک روزنامے کے مالک تھے۔ بعد ازاں ایک

اخبار کے مدیر اعلیٰ ہوئے اور ان دنوں مختلف اخبارات میں ہفتہ وار کالم لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس بات پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا تھا کہ فیض کو لندن اور ماسکو سے واپس آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے اعزاز میں ہونے والی دعوتوں کا سلسلہ رکنے ہی میں نہیں آتا۔ انہوں نے اس بات پر سخت تشویش ظاہر کی تھی کہ فیض کے اعزاز میں ایسی دعوتیں بھی ہو رہی ہیں۔ جن میں کوئی نہ کوئی مغنیہ گا کر ان کا کلام سناتی ہے۔"

ایسے بیمار لوگ ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں مگر ہر معاشرہ ایسے لوگوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ شرفا کی پگڑیاں اچھالتے رہیں۔ ہمارے ہاں بد قسمتی سے سرکار دربار میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے بھی لوگ فیض جیسوں کو تختہ مشق بنانا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اگر یہ لوگ اس ضمن میں فیض سے مشورہ حاصل کریں اور ان سے صاف کہہ دیں کہ آپ کی ذات پر حملہ کرنے سے ہمیں ذاتی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے تو فیض انہیں خود اپنے خلاف نظمیں اور مضامین لکھ کر دیا کریں لیکن جب یہ لوگ بے خبری میں حملہ کرتے ہیں تو اس کا دکھ فیض کو بھی ہوتا ہے۔ اس کا اظہار وہ بھلے ہی نہ کریں۔

دوستوں اور چاہنے والوں کی حد تک فیض بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دشمنوں کی صفیں بھی چاہنے والوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس کی ایک وجہ دوستی کے تصورات کے سلسلے میں ان کی روایت پرستی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ چند برس پہلے ان کے ایک پرانے دوست بے روزگار ہوئے تو فیض ان کے لئے کام مہیا کرنے کی فکر میں مدتوں غلطاں و پیچاں رہے۔ آخر میں جو کام ان کی کوششوں سے ملا وہ مشکل تھا چنانچہ ان کے بعض قریبی دوستوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ کام آپ کے دوست کے بس کا نہیں ہے اور اگر وہ اپنے فرائض بخوبی انجام نہ دے سکے تو آپ کی پوزیشن خراب ہو گی۔

فیض نے حسب معمول سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا۔ "ر کوئی بات نہیں ہے بے چارے کو روٹی تو ملنے لگے گی۔ بعد میں دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے۔"

کسی وجہ سے یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ تو فیض نے دو تین مہینے کی باقاعدہ جد و جہد کے بعد ان کے لیے ایک نیا ادارہ قائم کرایا اور یہ دوست کئی برس تک اس بانتخواہ ادارے کے

ساتھ منسلک رہے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین بڑا دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ یہ بزرگ پہلی آزمائش ہی میں لڑھک گئے۔ اور فیض کے دشمنوں کی طرف سے شروع کی جانے والی ایک مہم میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔ اس وجہ سے فیض کے اکثر دوست ان سے ناراض ہیں۔ مگر حضرت فیض کے آج بھی ان سے ویسے ہی مراسم ہیں اس لیے کہ انہوں نے "چلو چھوڑو کوئی بات نہیں" کہہ کر انہیں معاف کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی جب یہ دوست فیض کی مدد طلب کریں گے۔ انہیں مایوسی نہ ہو گی۔

انسان اتنی کمزور مخلوق ہے اور حالات نے اسے اس حد تک بے بس کر رکھا ہے کہ اسے معاف کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے لیکن معاف کرنے والا بھی انسان ہی ہو اور اسے اپنے آپ پر اتنا قابو ہو تو اس کے حوصلے کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ فیض تو ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ سمندر کے قرب کا احساس ہوتا ہے بے پایاں وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سمندر متلاطم اور مواج سمندر نہیں ہے۔ اس کی سطح پر سکون اور ٹھہراؤ اور روشنی اور زندگی کے نمو کے نشان ملتے ہیں۔ اس ناپید اکنار سمندر کی گہرائی میں کون سے اسرار پوشیدہ ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایسا شخص جسے درد سہنے اور اس کا بوجھ اٹھانے کا اس حد تک ملکہ حاصل ہے کہ اس کی پوری شاعری اس کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بظاہر اس قدر پرسکون اور مطمئن نظر آتا ہے۔ فیض کو کسی سے جھگڑتے، کسی پر ناراض ہوتے یا کسی کی مخالفت کرتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہو گا، اصل میں وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر آدمی مطمئن و مسرور نظر آئے اس کوشش میں وہ اکثر اپنا سکون بھی برباد کر لیتے ہیں۔ لندن سے واپس آتے ہوئے انہیں بمشکل چار چھ ماہ ہوئے ہیں۔ مگر ان کے شناسا اور آشناؤں کے جاننے اور ان سے واقفیت رکھنے والے اکثر اصحاب جن میں ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں ان کے پاس روزگار اور کام حاصل کرنے کے لئے پہنچ رہے ہیں اور فیض کے دوستوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس عرصے میں ان کی سفارشی چٹھیاں لے کر پہنچے ہیں۔ بے روزگاری ہمارے ہاں اس حد تک عام ہے کہ تمام تر نیک خواہشات کے باوجود ان کے لئے کام مہیا کریں۔ مگر فیض ساری دنیا کو خوش

دیکھنا چاہتے ہیں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اداس ہو جاتے ہیں۔ ایلس (بیگم) فیض اگر دو اور دو چار کی طرح سوچنے کی عادی نہ ہوتیں یا اپنی صلح کل طبیعت کی وجہ سے وہ بیگم کی ہر بات مان لینے کی عادت نہ ڈال لیتے تو ان کے گھر میں دنیا بھر کے بیکار، بے روزگار اور رنگارنگ قسم کے بے فکر لوگ جمع ہوتے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جب دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے تو قدرت ایک دوسرے کی کمی پوری کر کے جوڑوں میں توازن پیدا کرنے کا خود اہتمام کر دیتی ہے۔ میاں اگر بے فکر یا فضول خرچ ہے تو بیوی جزرس ہو گی۔ ایک کی ناعاقبت اندیشی دوسرے کی دور رس نگاہوں کی وجہ سے اپنا اثر کھو کر بیٹھے گی۔ فیض اور بیگم فیض کی حد تک یہ مقدمہ معجزانہ طور پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ فیض کی بیگم اگر ایلس کی بجائے کوئی اور خاتون ہوتیں تو معلوم نہیں موصوف کا کیا حشر ہوتا۔

جو لوگ عام زندگی میں فیض سے ملتے ہیں یا انہیں اٹھتا بیٹھتا دیکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ فیض اعلیٰ درجے کے منتظم بھی ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ انتظامی امور کے متعلق ان کا اندازہ دوسروں سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور وہ اپنے ماتحتوں یا ساتھ کام کرنے والوں پر حکم چلانے کے بجائے پیار، محبت اور شفقت سے دگنا کام لیتے ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں عام طور پر شاعروں کو یونہی ناکارہ اور کسی ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ فیض تو عام زندگی میں ظاہراً سست اور کاہل نظر آتے ہیں اور بات کرنے میں بھی حتی الوسیع بخل سے کام لیتے ہیں۔ جس آدمی نے کبھی اپنے ہاتھ سے اپنے ناخن تک نہ کاٹے ہوں اس کے بارے میں تنظیمی صلاحیت کے فقدان کا فیصلہ کر لینا غلط نہ ہو گا۔ جس زمانے میں وہ جیل میں تھے یا جب وہ بیرون ملک گئے ہوئے تھے ان کی چھوٹی لڑکی منیزہ کو یہی پریشانی رہی کہ وہاں ان کے ناخن کون کاٹتا ہو گا۔ جیل میں تو خیر مشقتی مل جاتے ہیں مگر جب وہ سوویت روس میں تھے تو بچی کی پریشانی انتہا پر تھی۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ وہاں پر کیا گزری۔ بہر حال جب وہ واپس آئے تو ان کے ناخن کٹے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ان کی تنظیمی صلاحیت کا اندازہ آرٹ کونسل لاہور کی حالت سے کیا جا سکتا ہے جن لوگوں نے اس ادارے کی زبوں حالی کا مشاہدہ فیض کے چارج لینے سے پہلے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس عمارت پر اصطبل کا گمان ہوتا تھا۔ نیشنل آرٹس گیلری کی تصویروں پر مٹی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی عمارت کے احاطے میں کتے لوٹتے تھے۔ تہذیبی سرگرمیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن فیض کے

اُٹھتے ہی یہ عمارت لاہور میں تہذیبی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔ دو سال کی مدت میں فیض نے اس کی بنیادوں کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اب اس کے زوال کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

زندگی کے متعلق فیض کا نظریہ انتہائی صحت مندانہ ہے مگر دیکھنے والوں کو وہ ہمیشہ بڑے "گمگومی" نظر آتے ہیں۔ جب تک دنیا سے لاکھوں اور غموں اور نفرتوں اور کدورتوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا وہ کڑھتے ضرور رہیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ دکھ اور غم اور منافقت کے خاتمے کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے آپ نے اور ہمارے جیسے لاکھوں کروڑوں دوسرے انسانوں نے ان حقیقتوں کو قبول کر لیا ہے مگر فیض اندر ہی اندر سلگتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ انتہائی "ڈل" بلکہ نئے ملنے والوں کو "بور" نظر آتے ہیں۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے وہ اکثر مجلس سے باہر نظر آئیں گے۔ مگر شام کو محفل برپا کرنے کی انہیں ہمیشہ خواہش رہتی ہے۔ دوستوں سے مل بیٹھنے اور ہاؤ ہو کرنے کے لئے وہ شام کو ہر کام چھوڑنے پر تیار ہوں گے جس زمانے میں وہ پاکستان ٹائمز لاہور کے مدیر تھے۔ اداریے بالعموم شام کی محفلوں کے اختتام پر، پریس میں کمپوزیٹروں کے برابر بیٹھ کر لکھتے تھے۔ موضوع کا انتخاب تو ہمیشہ صبح کو ہو جاتا تھا لیکن پریس والوں کو رات کے دس گیارہ بجے سے قبل کبھی نہیں ملتا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے عملے کا خیال تھا کہ وہ کام کو آخر وقت تک ٹالتے ہیں۔ اور جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس بوجھ کو اتارتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ رائے درست نہیں ہے۔ اصل میں وہ دن بھر اپنے موضوع کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور اس دوران میں غائب دماغی کے مظاہرے بھی کرتے رہتے۔ دن بھر یا شام کو ملنے والے اور محفل میں ان کے ساتھ بیٹھنے والے انہیں غیر حاضر پاتے تو شاعر سمجھ کر معاف کر دیتے حقیقتاً وہ آخر وقت تک اپنے اداریئے کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور اس کے بعد لکھتے تھے۔

مجلسی زندگی کی محبت اور لگن فیض کو لاہور اور امرتسر کے دوستوں کی صحبتوں سے ملی ہے زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے انہیں دو شہروں میں گزارا ہے۔ چنانچہ ان کی روایات ان کے خون میں رچی بسی ہیں میں نے چھ برس پہلے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ فیض وطن سے باہر نہیں رہ سکتے، ان کے قریبی دوست جانتے ہیں کہ گذشتہ دو تین برس میں لوگوں نے کس طرح انہیں ملک سے باہر رکھنے کی کوشش کی۔ ملک سے باہر انہیں کتنی بڑی بڑی پیش کشیں ہوئیں۔ کام اور دولت اور اطمینان د

آسودگی غرضیکہ پاکستان سے باہر رہ کر انہیں زندگی کی ہر آسائش میسر ہوسکتی تھی، ان کے دوستوں نے ہمدردی میں اور دشمنوں نے اپنی مخصوص اغراض کے تحت ان کو وطن نہ آنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جس شخص کی روح میں، وطن کی مٹی کی باس رچی ہو اور جسے اس کے پھولوں، بہاروں، نگاروں اور اس کے پتہ پتہ سے والہانہ عشق ہو، وہ وطن کی محفلوں، ہواؤں، دریاؤں، چشموں اور سب سے بڑھ کر لوگوں سے کیسے دور رہ سکتا ہے۔ فیض کے خمیر میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس لئے وہ ملک سے باہر کبھی نہیں رہ سکتے۔ وہ لندن اور ماسکو اور کیوبا اور الجزائر میں گھومتے ہوئے بھی، اپنے وطن اپنے شہر اور اپنے دوستوں کو فراموش نہیں کر سکے ملک سے ڈیڑھ دو برس کی غیر حاضری کے دوران انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہجر کے یہ دن رات انہوں نے کیسے کاٹے ہیں اور غریب الوطنی کے احساس نے انہیں کیا کیا چرکے لگائے ہیں۔

عوام دوستی، شاعرانہ صلاحیت اور تنظیمی استعداد کے باوجود فیض نے بڑا شاہانہ مزاج پایا ہے۔ یہ چیز انہیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کے والدین کے پاس بہت اراضی تھی لیکن وہ بھی کنبے کو، دوستوں کو اور ملنے والوں کو عمر بھر پالتے رہے، کسی کو ولایت بھیج رہے ہیں۔ کسی کو تعلیم دلا رہے ہیں۔ کسی کی شادی کرانے میں لگے ہیں۔ لہذا والد کی وفات کے بعد خاندانی ملکیت کا خاصا بڑا حصہ بیچ کر قرضہ اتارا گیا، فیض کو اپنی وراثتی جاگیر سے عملاً شاہانہ مزاج کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اس کے باوجود ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں ان کو بڑی مسرت ملتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ کے دوست ہیں اور جس لڑکی سے عشق کر رہے ہیں اس کے والدین شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتے تو فیض رشتہ طے کرانے کی خاطر خود ساتھ چلنے کی پیش کش کر دیں گے۔ ایسے دوستوں کو ملامت بھی کریں گے جو ناکام عاشقوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ غالباً وہ ان کے دکھ درد کو ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں اور اس کرب میں خود کو مبتلا پاتے ہیں۔ جو ''یہ۔ عاشقاں کے لئے مخصوص ہے ان سے اور کچھ نہیں بن پڑتا تو نامراد عاشقوں کو ''بک اپ'' کرنے اور دوبارہ قسمت آزمائی کرنے کا مشورہ ضرور دیتے ہیں۔

انکے شاہانہ مزاج کا ایک دلچسپ قصہ اور سن لیجئے۔

بی اے کرنے کے بعد جب انہیں ایم اے میں داخلے کے لئے گھر سے پیسے ملے تو لاہور پہنچ کر

انہوں نے کل رقم جشن مے نوشی اور "ہاؤ ہو" کی نذر کر دی جو کچھ بچا وہ کالج پہنچ کر پتہ چلا کہ بہت کم ہے اور داخلے کے لئے مزید دو سو روپے درکار ہیں۔ ان کے پاس صرف نو روپے تھے۔ معلوم ہوا کہ عربی ایم اے کلاس میں داخلے کی فیس نو روپے ہے۔ چنانچہ انہوں نے سو روپے جمع کر کے انگریزی کی بجائے عربی ایم اے میں داخلہ لے لیا اور دو سال پورے کئے اس کے بعد پھر انگریزی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

فیض کو کوئی کام نہ ہو اور انہیں گھر ہی پر رہنا ہو تو وہ بڑے ٹھاٹھ سے دن گزاریں گے یقیناً دیر تک بستر میں بیٹھ کر چائے پیتے رہیں گے، اخبار پڑھتے رہیں گے۔ اور مطالعہ کرتے رہیں گے۔ فرصت ہی ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ نہانے سے موصوف حتیٰ الامکان گریز کرتے ہیں۔ بیگم کے اصرار پر بادل ناخواستہ غسلخانہ کا رخ کرتے ہوئے بھی یہ ضرور پوچھیں گے کہ نہانا ضروری ہے۔ البتہ شام کو وہ اکیلے نہیں بیٹھ سکتے جب روز و شب ملتے ہیں اور شفق کی سرخی آسمان پر چھا جاتی ہے اور رات تاریکی کا بیکراں دبیز پردہ لے کر لپکتی ہے تو وہ اس کی تاریکی اور سناٹے اور خاموشی اور ویرانی سے بچ نکلنے کے لیے زندگی کے دکھوں کو بھولنے کی خاطر اور پرانے زخموں کو ڈھانپنے کے لئے رندوں کی محفل کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ایسی محفل جہاں ان کے جیسے لوگ ہوں جہاں حسن کی، عشق کی محبت اور مسرت کی باتیں ہوں اور جہاں بیٹھے بیٹھے رات کی گرانباری کے ختم ہونے اور صبح کے بھیلے قدموں کے پہنچنے کا احساس تیز تر ہو سکے۔

فیض

# پاکستان کہاں ہے؟

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"پاکستان سے"

"پاکستان! وہ کہاں ہے؟ وہ ہندوستان میں ہے کہ افغانستان میں؟"

"نہیں بھئی! ہندوستان افغانستان میں نہیں ہے، بالکل الگ ملک ہے۔"

"اچھا تو آپ کی آبادی کتنی ہے؟"

"نو کروڑ"

"کیا؟ نو لاکھ یا نو کروڑ"

"نو کروڑ"

"اوہ، پھر تو بہت بڑا ملک ہے، تعجب ہے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہی نہیں۔"

یہ تو خیر کیوبا کی بات ہے اور اس دور افتادہ خطے میں پاکستان کے خدوخال سے ناآشنائی محل تعجب نہیں (یا شاید ہے اس لئے کہ بھارت، افغانستان، مصر، انڈونیشیا، گھانا، وغیرہ وغیرہ کے سفارتی دفاتر ہوانا میں موجود ہیں) لیکن دو چار قریبی ممالک کے علاوہ جہاں بھی جائیے آپ کو اسی قسم کی عدم واقفیت سے سابقہ پڑے گا۔ ہمارا نام تو خیر سب لوگ جانتے ہیں اور بیشتر کو ہمارا محل وقوع بھی معلوم ہے لیکن پاکستان کیا ہے اور کیوں ہے اور ہمیں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا ہے جو کسی اور کے پاس نہیں یہ معدودے چند صاحب علم یا صاحب غرض افراد کے علاوہ

بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یہ سرخاب کا پَر میں طنز سے نہیں کہہ رہا ہوں، قصہ یوں ہے کہ دنیا کے قریب قریب ہر ملک نے کوئی نہ کوئی علامت، کوئی نہ کوئی نشان، کوئی امتیازی طغرا اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور اس ملک کا نام اس نشان یا علامت کا تصور اپنے ساتھ لاتا ہے اس تصور میں اس ملک کی تاریخ، اس کی تہذیب اور کلچر، اسکی قومی ماہیت اور مزاج سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ چین، جاپان، انڈونیشیا، برما، لنکا، ہندوستان، ایران، عرب، عراق، ترکی، مصر، حبشہ، کینیا، گھانا کسی چھوٹے بڑے ملک کا نام لیجئے اس نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی تصویر ذہن میں ضرور اُبھرے گی۔ ظروف، قالین، باغات، محلات، مناور، پیگوڈے، سادھو، مجسمے، تصاویر، رقاص، ریت کے ٹیلے، کھجور کے درخت، مورچھل، ہاتھی دانت، تخت جمشید، حافظ و خیام، الف لیلہ، ملکہ صبا، اہرام فراعنہ، ابوالہول، گینڈے، شیر ببر، بھالے، تیر کمان، کچھ بھی سہی، ہر ملک نے اپنے ماضی و حال کے خزائن میں سے کچھ ایسی علامتیں یا خود منتخب کر رکھی ہیں یا یہ چیزیں پہلے سے معروف تھیں اور اب انہیں ایک نیا قومی رنگ پہنا دیا گیا ہے۔ لیکن ہر کسی کے پاس کوئی سرخاب کا پَر ہے ضرور، اور اس علامت کی تشہیر کے لئے لوگ طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ بیج، تمغے، پھریرے، مہریں، ماڈل، پھٹے بنائے، ڈھالے بیچے اور بانٹے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی اجتماعوں اور تبادلہ وفود میں یہ تحفے تحائف کے کام آتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر ملک نے اپنا ایک ٹریڈ مارک بنا رکھا ہے جو ہر موقع پر تعارف اور جان پہچان کے کام آتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ ہمارا یعنی پاکستان کا ٹریڈ مارک کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو اب غور فرمایئے ورنہ پردیس میں بار بار اور جگہ جگہ آپ کو ایسے ہی سوالات کا سامنا ہوگا جو ابتداء میں لکھ چکا ہوں اور اگر آپ کو ہندوپاکستان کی تاریخ، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست، ہندو مسلم چپقلش اور مسئلہ کشمیر کی تفصیلات بیان کرنے کی فرصت اور دماغ ہے تو بھی آخر آپ انفرادی سعی و تبلیغ سے کتنے اشخاص کو "مشرف بہ پاکستان" کر سکیں گے اس سلسلہ میں ہمارے سفارت خانوں کے عمال پر مدیران جرائد اور مراسلہ نویس حضرات اکثر برستے رہتے ہیں فلاں ملک میں پاکستان کی پبلسٹی نہایت ناقص ہے۔ آخر ہمارے سفارتی نمائندے کس مرض کی دوا ہیں؟ فلاں شہر سے مجھے ایک لفافہ موصول ہوا ہے جس پر پاکستان "انڈیا" لکھا ہے ہمارا سفارتی

حملہ کیا کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ شاید ہمارے سفارتی دفاتر اس بارے میں قطعی بے خطا بھی نہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک حد تک وہ عاجز بھی ہیں، ہماری قومی تہذیب، ثقافت یا شخصیت کا تعین ہمارے سفارتی اداروں کا منصب یا ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری تو گھر والوں کی ہے جس میں حکومت اہل دانش اور ارباب سیاست سبھی شامل ہیں سفارت خانے تو آپ کے بارے میں وہی کچھ مشتہر کریں گے جو آپ ان تک پہنچائیں گے اور اگر آپ کو خود اپنا ناک نقشہ نہیں معلوم تو بچارے سفارتی افسر اپنے میزبانوں کے سامنے کس مخلوق کی تصویر پیش کریں۔

تو پھر کیا کرنا چاہیئے، شاید آپ فرمائیں کہ ہمارے قومی جھنڈے پر ستارہ و ہلال موجود ہے یہ اسلامی نشان ہے۔ ہمارے قومی کردار کی وضاحت کے لئے یہ علامت کافی ہونا چاہیئے۔ اگر ستارہ و ہلال صرف پاکستانِ امتیاز ہوتا تو شاید اس کی تفسیر و تشریح سے کچھ مشکل حل ہو جاتی۔ لیکن یہ نشان تو کسی نہ کسی صورت میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے جھنڈوں اور طغروں کا حصہ ہے اور اسے پاکستان کی سرزمین سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تاریخی اعتبار سے اس نشان پر ترکوں کا حق بہرحال ہم پر فائق ہے ہمیں اپنے تعارف کے لیے لامحالہ اپنی تاریخ تہذیب اور جغرافیہ کے ایسے مظاہر سے رجوع کرنا پڑے گا جو خالص ہمارے اور بلاشبہ پاکستانی ہوں اور ان میں کوئی بھی صنف لے لیجئے تاریخی آثار و مقامات، عوامی فن و ہنر کی اقسام، مناظرِ فطرت کا جلوس ہمارا دیس تو ہر لحاظ سے بہت حسین اور بہت بھرپور سرزمین ہے۔ تاج محل اور لال قلعہ ادھر رہ گئے تو کیا ہوا اور ہزار شے ہیں جنہیں سلیقہ اور بناؤ سنگھار سے ایسا ہی مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کچھ طے تو کیجئے کہ آپ کو کیا عزیز ہے۔ غیروں سے منوانے کی باری تو بعد میں آئے گی۔

اور پھر کسی ایک چیز پر اکتفا کرنا ضرور ہے، موہنجو ڈارو سے لے کر مسجد اورنگ زیب بلکہ مزار اقبال تک کے ٹوٹے لے کر کاس بازار تک ان کے پاکستانی نام کب رکھے جائیں گے۔ سوات کے چوبی الواح مزار سے لے کر چٹا گانگ کے قبائلی کھیلوں تک اپنی سرزمین کی تاریخ، فنون اور مناظر سے کوئی ایسی دس بیس حسین چیزیں چن لیجئے جنہیں آپ کسی اجنبی کے سامنے رکھ سکیں اور کہہ سکیں کہ دیکھو برادر یہ ہم ہیں، یہ ہندوستان نہیں ہے اور افغانستان بھی نہیں ہے۔ یہ نہ ایران ہے اور نہ توران نہ عرب ہے نہ عجم یہ سب کچھ جو تم نہ دیکھتے ہو پاکستان ہے یہ دیکھو سوات کا

چنہ ہے۔ یہ سندھ کی رَلی ہے۔ یہ پشاوری حقہ ہے، یہ بہاولپور کی صراحی ہے۔ یہ سلہٹ کی چٹائی ہے۔ اور یہ کومیلا کی پنکھیا۔ یہ درّہ خیبر ہے یہ شالیمار ہے، یہ شاہ رکن عالم کا مزار ہے یہ سات گنبد والی مسجد ہے۔ یہ جیل اور دیودار کے پیڑ ہیں۔ یہ چھالیہ اور بانس کے جھنڈ یہ سرسوں کے کھیت ہیں یہ کاسنی کی باڑھ ہے یہ میگھنا کے کنارے مچھیروں کی کشتیاں ہیں۔ یہ کبڈی ہو رہی ہے۔ یہ نیزہ بازی، یہ خٹک ناچ، یہ علم اٹھ رہے ہیں یہ نماز ہو رہی ہے یہ دودھ بلویا جارہا ہے۔ یہ پٹ سن کی فصل سمیٹی جارہی ہے یہ الغوزہ ہے یہ اکتارہ ہے یہ مشاعرے کی محفل ہے یہ چراغوں کا میلہ ہے یہ عمارتیں، یہ کھنڈر، یہ وادی، یہ صحرا یہ کھیل تماشے یہ خشوع وخضوع، یہ نوادر یہ دست کاریاں، یہ سب چیزیں ہماری ہیں یہ سب کچھ ہم ہیں اور ہم پاکستان ہیں۔

ہمارے ہاں خیر سے وزارتِ تعلیم بھی ہے اور وزارتِ اطلاعات بھی ہے۔ سیاحت کا محکمہ بھی وزارتِ خارجہ بھی ہے۔ پی آئی اے بھی ہے۔ آرٹ کونسلیں بھی ہیں، ادبی اور فنی ادارے بھی ہیں۔ اور ممالک غیر میں پاکستان اور اہلِ پاکستان کی دلکش شبیہ کی تخلیق ان سب کے فرائض میں شامل ہے۔ اور پھر چند کتابیں اور کتابچے، تصاویر کے سیٹ نمائشی اسٹال وغیرہ کے لئے کچھ ایسا قارون کا خزانہ بھی درکار نہیں۔ محض شوق فضول اور ذوقِ نظر کی بات ہے۔ یہ اس لئے مہیا نہیں ہیں کہ اول تو ہم گھر کی کسی مرغی کو دال سے اوپر اہمیت نہیں دیتے اور دوسرے ایک قومی مسئلہ کی حیثیت سے ہم نے اس امر پر کبھی غور نہیں کیا۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ہماری تہذیبی اور قومی رونمائی پر بالکل توجہ نہیں دی، وزارتِ اطلاعات کی زیرِ نگرانی بعض تہذیبی موضوعات پر کچھ رسالے چھپ چکے ہیں محکمہ صحت نے بھی تھوڑی بہت طبع آزمائی کی ہے ہمارے تاریخی نوادر کی ایک آدھ نمائش بھی امریکہ اور جاپان کا دورہ کر چکی ہے۔ لندن کے ایک بہت بڑھیا بازار میں پاکستانی مصنوعات کی ایک بہت گھٹیا دکان بھی موجود ہے اور ہماری بیگمات بھی کبھی ملک کے اندر اور باہر اس سلسلہ میں کچھ شوق فرماتی ہیں۔ لیکن ڈیڑھ اینٹ کی اتنی بہت سی مسجدوں کے بعد بھی کسی مکمل عمارت کے بام و در کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ہم نے ان بے ربط، بے سلیقہ اور سطحی کوششوں میں پیسے بھی بہت گنوائے ہیں اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

بیچ میں ایک مشکل یہ بھی آن پڑی ہے کہ قومی تہذیب، ثقافت یا کلچر کا نام لیجئے تو

ایک طبقہ کا ذہن فوراً ہیرا منڈی، مس شرارہ، مس ستارہ اور زندہ ناچ گانے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اچھے خاصے معقول اور ثقہ لوگ چلانے لگتے ہیں کہ "کلچر" کے نام پر "ثقافت کی آڑ میں" ان کے دامنِ عصمت پر دست درازی کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اگر کلچر ثقافت یا تہذیب سے محض وہی شے مراد لی جائے جسے ہمارے ہاں "کلچرل شو" کہتے ہیں تو شاید یہ واویلا ایسا بے جا بھی نہیں لیکن قومی تہذیب یا ثقافت کی یہ قطعی غلط اور نامعقول "تاویل" آخر کیوں ضروری ہے۔ مجھ پر تو خیر ذاتی طور پر اس سلسلہ میں اتنی خشت باری ہو چکی ہے کہ شاید میری رائے آپ کی نظر میں زیادہ وقیع نہ ہو لیکن آپ خود سنجیدگی سے غور فرمائیے کہ اوپر اتنی بہت سی چیزیں جو میں نے گنوائی ہیں کیا سب کی سب قاطع زہد اور دشمن تقویٰ ہیں۔ مثلاً آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ سرود و نغمہ جس پر اتنا قصہ رہتا ہے محض لچر فلمی گانوں اور گھٹیا مغربی موسیقی سے عبارت نہیں اس میں ہیر، بھے شاہ، ماہیا، ٹپہ، بھٹیالی، قوالی حتیٰ کہ حمد و نعت اور قومی ترانہ بھی شامل ہے کیا آپ کی رائے میں یہ سب کچھ فحش ہے؟ لیکن اس پر بھی جھگڑے کی ضرورت نہیں، اگر آپ لحن و سماع کو کسی طرح برداشت کرنے پر تیار نہیں اور ان کی ہر ایک حکومت کو مردود اور غیر مشروع جانتے ہیں تو نقاشی، خطاطی، دست کاری، تعمیرات، ادب، کھیل، سیر و شکار، دشت و مرغزار اپنی زندگی کے کسی تہذیبی مشغلے سے کچھ ہی پسند فرما لیجئے جسے باہر کی دنیا آپ سے مخصوص اور مختص کر سکے۔

بات تو قومی ٹریڈ مارک سے ابتدا ہوئی تھی لیکن اس بنیادی مسئلے سے متعلق بہت سی فرعی الجھنیں اور بھی ہیں۔ مثلاً پردیس میں قومی اور مذہبی تہوار منانے کا سوال ہے۔ انگلستان کے لوگ کرسمس، نیا سال، ایسٹر، گائی فاکس ڈے وغیرہ کا ہفتوں پہلے سے اہتمام کرتے ہیں اور قومی برادریوں نے بھی اپنی مخصوص تقریبات کے لئے رسوم و مناسک طے کر رکھی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی ہولی، دیوالی، بسنت اور دسہرہ پر کچھ ہنگامہ کر لیتے ہیں لیکن ہمارا کوئی تہوار آ جائے تو بلیشتر بغلیں جھانکنے کے سوا کسی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ یہاں لندن میں عید آئی اور گزر گئی۔ یوم پاکستان آیا اور گیا اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یوم پاکستان پر ہمارے ہائی کمیشن میں چائے اور مٹھائی ضرور تقسیم ہوئی اور سچ یہ ہے کہ مٹھائی بہت عمدہ تھی لیکن (LAWNDES SQUARE) لاؤنڈز اسکوائر میں برتنوں کی کھنک کے علاوہ اس ساری سرزمین میں جہاں قریباً دو لاکھ پاکستانی مقیم

ہیں کوئی حرف وصدا اپنے کانوں تک نہیں پہنچی صرف لیڈز (LEDs) یونیورسٹی کے کچھ مستعد طلبا نے جشن پاکستان کا اہتمام کیا۔ جو سنا ہے کافی کامیاب رہا ہیں سمجھتا ہوں کہ اگر گھر کے اندر ہمارے بہت سے رسمی میلے ٹھیلے اُجڑ بھی گئے ہیں تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن گھر سے باہر ایسی تقریبات پر کچھ ہاؤ ہو کی صورت متعین ہو سکے تو یار و اغیار دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

یہ تصویر کا ایک پہلو ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ناک کٹوانے کا کوئی عنوان ہاتھ آجائے تو کیا مجال جو ابنائے وطن کبھی چوک جائیں۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سوائی برس دو برس پہلے چیچک کے قصے میں ہوئی۔ اگرچہ اسے ہوا دینے میں زیادہ ہاتھ تو یہاں کے ایک مفسد اور متعصب طبقہ کا تھا۔ لیکن اس میں کچھ دخل ہمارے ہاں کے ڈاکٹروں اور مسافر برادروں کا بھی ضرور ہوگا یہ تو کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ پانچ دس روپے کے عوض ٹیکہ کا جھوٹا سرٹیفکیٹ اکثر مل جایا کرتا تھا۔ خیر یہ بات تو اب پرانی ہو چکی لیکن حال ہی میں حبیب بینک اور اس کے ملازمین کا جھگڑا چلا، لندن کے بیشتر اخبارات میں سرخیاں لگیں، تصویریں چھپیں، صدر پاکستان کو خطوط گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ تک سوال گیا اور پھر کہیں جاکے معاملہ رفع دفع ہوا اور یہ ساری جگ ہنسائی چالیس پچاس پونڈ کی خاطر۔ حق پر کون تھا کون نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم، لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ اتنی چھوٹی سی رقم کے لئے اتنے بڑے ادارے کو اپنا فضیحتا کروانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ قصہ نپٹا تو ہمارے ہائی کمیشن کے شعبہ تعلیم اور پاکستانی طلبا کی فیڈریشن میں تو تکار شروع ہوئی اس تکرار کا سرپیر بھی کچھ ہمارے پلے نہیں پڑا۔ سنی سنائی یہ ہے کہ ہائی کمیشن والے مصر تھے کہ فیڈریشن کا آئین بدلا جائے تاکہ لندن سے باہر رہنے والے طلباء کو زیادہ نمائندگی مل سکے۔ فیڈریشن والے کہتے تھے کہ ہم آئین بدلنے کو تیار ہیں لیکن آپ ہمارے معاملات میں دخل دینے والے کون، اس طرح ایک طرف فیڈریشن کے دفتر پر تالے پڑ گئے اور دوسری طرف اشتہار بازی اور بیان بازی کے دروازے کھل گئے۔ سُنا ہے اب یہ معاملہ بھی سلجھ گیا ہے۔

بیک بعد از خرابی بسیار:

انگریزی میں کہاوت ہے کہ بیکار دماغ شیطان کی کارگہ بن جاتا ہے اور ہمارے

ہاں کہتے ہیں کہ آؤ بہن لڑیں، چنانچہ اپنی برادری میں اس نوع کے جھگڑوں جھمیلوں کی بنیادی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی تفریح و تسکین کے لئے انبساط اور افتخار کے اسباب کوئی فراہم نہیں کرتا، تو سب کہتے ہیں کہ آؤ بھئی لڑیں اور جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان اسباب کی فراہمی کے ذمہ دار سفارتی افسر نہیں قومی اور وطنی ادارے ہیں۔ اگر آپ اس فرض کو اہمیت نہیں دیتے تو پھر یہ گلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

# اشعار

رات یُوں دِل میں تری کھوئی ہُوئی یاد آئی
جَیسے وِیرانے میں چُپکے سے بہار آجائے
جَیسے صحراؤں میں ہَولے سے چلے بادِ نسیم
جَیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

# خُدا وُہ وقت نہ لائے.....

خُدا وُہ وقت نہ لائے کہ سوگ وار ہو تُو
سُکوں کی نیند تُجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسّرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تُجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دِل گُداز ہو تیرا
ہُجُوم یاس سے بے تاب ہو کے رہ جائے
وُفُورِ دردسے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرُورِ حُسن سراپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تُو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غم گُسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنّا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جُھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تُجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خُدا وہ وقت نہ لائے کہ تُجھ کو یاد آئے
وُہ دِل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے
وُہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

# سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خُود فراموشی  محفِل ہشت و بُود وِیراں ہے
پیکرِ اِلتجا ہے خاموشی  بزمِ انجُم فسُردہ ساماں ہے

آبشارِ سکُوت جاری ہے
چار سُو بے خُودی سی طاری ہے

زِندگی جُزوِ خواب ہے گویا  ساری دُنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر  چاندنی کی تھکی ہُوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے  کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دِل کے خموش تاروں سے  چھن رہا ہے خُمارِ کیف آگیں

آرزُو، خواب، تیرا رُوئے حسیں

# آج کی رات

آج کی رات سازِ دَرد نہ چھیڑ

دُکھ سے بھرپُور دِن تمام ہُوئے — اَور کل کی خبر کِسے معلُوم؟
دوش و فردا کی مِٹ چُکی ہیں حُدود — ہو نہ ہو اب سحر، کِسے معلُوم؟

زِندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
اِیزدِیّت ہے مُمکِن آج کی رات

آج کی رات سازِ دَرد نہ چھیڑ

اب نہ دُہرا فسانہ ہائے الم — اپنی قِسمت پہ سوگوار نہ ہو
فِکرِ فردا اُتار دے دِل سے — عُمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو

عہدِ غم کی حِکایتیں مت پُوچھ
ہو چُکیں سب شِکایتیں مت پُوچھ

آج کی رات سازِ دَرد نہ چھیڑ

# ایک منظر

بام و در خامُشی کے بوجھ سے چُور    آسمانوں سے جُوئے دَرد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نُور    شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مُضمحِل لَے رباب ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نَوحہ کُناں

# مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبُوب نہ مانگ

مُجھ سے پہلی سی محبّت مری محبُوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صُورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے
تُو جو مل جائے تو تقدیر نگُوں ہو جائے
یُوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یُوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گِنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہُوئے
جا بجا بکتے ہُوئے کُوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہُوئے خُون میں نہلائے ہُوئے

جسم نکلے ہُوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہُوئی گلتے ہُوئے ناسُوروں سے
لَوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دِل کش ہے ترا حُسن، مگر کیا کیجے

اَور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سِوا
راحتیں اَور بھی ہیں وصل کی راحت کے سِوا
مُجھ سے پہلی سی محبّت مِری محبُوب نہ مانگ

# رقیب سے

آ کہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اِس دِل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بُھلا رکھی تھی دُنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وُہ راہیں جن پر
اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گذرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی اِن آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبُوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبُوس کی افسُردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نُور

جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تُو نے دیکھی ہے وُہ پیشانی، وُہ رُخسار، وُہ ہونٹ
زندگی جن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وُہ کھوئی ہُوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلُوم ہے کیُوں عُمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مُشترکہ ہیں اِحسان غمِ اُلفت کے
اِتنے اِحسان کہ گِنواؤں تو گِنوا نہ سکوں
ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اَور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکُوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی،
یاس وحرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تُو نے دیکھی ہے وُہ پیشانی، وُہ رُخسار، وُہ ہونٹ
زِندگی جِن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تُجھ پہ اُٹھّی ہیں وُہ کھوئی ہُوئی ساحِر آنکھیں
تُجھ کو مَعلُوم ہے کیُوں عُمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مُشترکہ ہیں اِحسان غمِ اُلفت کے
اِتنے اِحسان کہ گِنواؤں تو گِنوا نہ سکوں
ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اَور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سِیکھی، غرِیبوں کی حمایت سِیکھی
یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سِیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سِیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

# تنہائی

پھر کوئی آیا دِلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہ رَو ہو گا، کہیں اَور چلا جائے گا
ڈھل چُکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غُبار
لڑکھڑانے لگے اَیوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اِک راہ گذار
اجنبی خاک نے دُھندلا دِیئے قدموں کے سُراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مُقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

# چند روز اَور مِری جان!

چند روز اَور مِری جان! فقط چند ہی روز
ظُلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبُور ہیں ہم
اَور کُچھ دیر سِتم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی مِیراث ہے معذُور ہیں ہم
جِسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجِیریں ہیں
فِکر محبُوس ہے، گُفتار پہ تعزِیریں ہیں
اپنی ہِمّت ہے کہ ہم پِھر بھی جِئے جاتے ہیں
زِندگی کیا کِسی مُفلِس کی قبا ہے جِس میں
ہر گھڑی دَرد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکِن اب ظُلم کی مِیعاد کے دِن تھوڑے ہیں
اِک ذرا صبر، کہ فریاد کے دِن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہُوئی وِیرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یُوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گِراں بارِ ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حُسن سے لِپٹی ہُوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شِکستوں کا شُمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دِل کی بے سُود تڑپ، جِسم کی مایُوس پُکار
چند روز اَور مری جان! فقط چند ہی روز

# کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے    کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ اُن کا    جہاں بھر کی دھتکار اُن کی کمائی
نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے    غلاظت میں گھر نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اِک دُوسرے سے لڑا دو    ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دِکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے    یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے
یہ مظلُوم مخلُوق گر سر اُٹھائے    تو اِنسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دُنیا کو اپنا بنا لیں    یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

کوئی اِن کو اِحساسِ ذِلّت دِلا دے
کوئی اِن کی سوئی ہُوئی دُم ہِلا دے

# بول

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دُکاں میں
تُند ہیں شُعلے سُرخ ہے آہن
کُھلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اِک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زِندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

# موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سُلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نِکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اَور ـــــ مُشتاق نِگاہوں کی سُنی جائے گی
اَور ـــ اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات
اُن کا آنچل ہے، کہ رُخسار، کہ پیراہن ہے
کُچھ تو ہے جس سے ہُوئی جاتی ہے چِلمن رنگیں
جانے اُس زُلف کی موہُوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وُہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حُسنِ دِل آرا کی وُہی دھج ہو گی
وُہی خوابیدہ سی آنکھیں وُہی کاجل کی لکیر

رنگِ رُخسار پہ ہلکا سا وُہ غازے کا غُبار
صندلی ہاتھ پہ دُھندلی سی حِنا کی تحریر
اپنے افکار کی، اشعار کی دُنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سُرخ وُ سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم وُ حوّا کی اَولاد پہ کیا گذری ہَے؟
مَوت اَور زِیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گُذرے گی، اجداد پہ کیا گذری ہَے؟
اِن دمکتے ہُوئے شہروں کی فراواں مخلُوق
کیُوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہَے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہَے جوبن جن کا
کِس لِئے اُن میں فقط بھُوک اُگا کرتی ہَے؟

یہ ہر اِک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بُجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اِک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتَو سے چَراغاں ہَیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہَیں، اَیسے کئی اَور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھُلتے ہُوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دِل آویز خطُوط
آپ ہی کہیے کہیں اَیسے بھی افسُوں ہوں گے
اپنا موضُوعِ سُخن اِن کے سِوا اَور نہیں
طبعِ شاعِر کا وطن اِن کے سِوا اَور نہیں

# ہم لوگ

دِل کے اَیواں میں لئے گُل شُدہ شمعوں کی قطار
نُورِ خورشید سے سہمے ہُوئے اُکتائے ہُوئے
حُسنِ محبُوب کے سیّال تصوُّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہُوئے، لِپٹائے ہُوئے

غایتِ سُود و زِیاں، صُورتِ آغاز و مآل
وُہی بے سُود تجسُّس، وُہی بے کار سوال

مُضمحِل ساعتِ اِمروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نِڈھال
تِشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اِک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دِل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اَور اِک اُلجھی ہوئی موہُوم سی درماں کی تلاش
دشت و زِنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

# سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا، جکڑے ہُوئے ہات
رات کے سخت و سِیہ سِینے میں پیوست رہے
جِس طرح تِنکا سمُندر سے ہو سرگرم ستیز
جِس طرح تیتری کُہسار پہ یلغار کرے
اَور اب رات کے سنگین و سِیَہ سِینے میں
اِتنے گھاؤ ہیں، کہ جِس سِمت نظر جاتی ہے
جابجا نُور نے اِک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صُبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہات تو ہیں!
اَور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہات تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اَور مشرِق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہُوا دِن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

# اے دِلِ بے تاب ٹھہر

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی جاتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہُو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹُوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہُو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رُخسارِ سحر
صُبح ہونے ہی کو ہے اے دِلِ بے تاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندئ آداب ابھی
اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گراں بارئ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

# مِرے ہمدم مِرے دوست

گر مُجھے اِس کا یقیں ہو، مِرے ہمدم، مِرے دوست
گر مُجھے اِس کا یقیں ہو کہ، ترے دِل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دِل جُوئی، مِرے پیار سے مِٹ جائے گی
گر مِرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جِس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہُوا بے نُور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ

تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اِس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
روز و شب، شام و سحر، میں تجھے بہلاتا رہوں
مَیں تجھے گیت سُناتا رہوں، ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صُبح کے، مہتاب کے، سیّاروں کے گیت
تجھ سے مَیں حُسن و محبّت کی حکایات کہوں
کیَسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیَسے اِک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کِس طرح عارضِ محبوب کا شفّاف بلَور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہَے

کیسے گلچیں کے لئے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

○

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دِل کو گُماں
وُہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دِل کے داغ کہاں ہیں، نِشستِ دَرد کہاں

# غزل

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام
چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہُوا ہے لبالب ہر اِک نگاہ کا جام
گلے میں تنگ ترے حرفِ لُطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

# صُبحِ آزادی

اگست ۱۹۴۷

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وُہ اِنتظار تھا جس کا، یہ وُہ سحر تو نہیں
یہ وُہ سحر تو نہیں جس کی آرزُو لے کر
چلے تھے یار کہ مِل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دِل

جواں لہُو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے

دیارِ حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پُکارتی رہیں باہیں، بدن بُلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نُور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنّا، دبی دبی تھی تھکن
سُنا ہے ہو بھی چُکا ہے فِراقِ ظُلمت و نُور
سُنا ہے ہو بھی چُکا ہے وِصالِ منزِل و گام
بدل چُکا ہے بہت اہلِ درد کا دستُور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دِل کی جلن
کِسی پہ چارۂ ہجراں کا کُچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کِدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کُچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دِل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزِل ابھی نہیں آئی

# لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دِل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیِ ایام ابھی اَور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

# ڈھلتی ہے موجِ مے

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات اِن دِنوں
کِھلتی ہے صُبح گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر
وِیراں ہیں جام، پاس کرو کُچھ بہار کا
دِل آرزُو سے پُر کرو، آنکھیں لہُو سے پُر

○

نہ پُوچھ جب سے تِرا اِنتظار کِتنا ہے
کہ جِن دِنوں سے مُجھے تیرا اِنتظار نہیں
تِرا ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازُو، تِرا کِنار نہیں

# شورشِ بربط و نَے

## پہلی آواز

اب سعی کا اِمکاں اَور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چُکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چُکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چُکا
اب اَور کِسی فردا کے لئے اِن آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کِس خوابِ کے جھُوٹے افسُوں سے تسکینِ دِلِ ناداں کیجے
شیرینیِ لب، خوشبُوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں

شادابیِ دِل تفریحِ نظر، اب زِیست کا درماں کوئی نہیں
چلنے کے فسانے رہنے دو، اب اُن میں اُلجھ کر کیا لیں گے
اِک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وُہ میرا کفن، یہ میری لحد، وُہ تیری ہے

## دُوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اِس بزم میں اپنی مشعلِ دِل بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اِک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایّام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیِ کاکُل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذّتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اِس دیدۂ تر کا شُکر کرو، اِس ذوقِ نظر کا شُکر کرو
اِس شام و سحر کا شُکر کرو، اِن شمس و قمر کا شُکر کرو

## پہلی آواز

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر، اِن شمس و قمر کا کیا ہو گا
رعنائیٔ شب کا کیا ہو گا، اندازِ سحر کا کیا ہو گا
جب خُونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہُوئیں
اِس دیدۂ تر کا کیا ہو گا، اِس ذَوقِ نظر کا کیا ہو گا
جب شعر کے خیمے راکھ ہُوئے، نغموں کی طنابیں ٹُوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اِس کِلکِ گہر کا کیا ہو گا
جب کُنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جَیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گُل، اِس دردِ جگر کا کیا ہو گا

## دُوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اِس خُوں میں حرارت ہے جب تک
اِس دِل میں صداقت ہے جب تک، اِس نُطق میں طاقت ہے جب تک

اِن طوق وسلاسل کو ہم تُم سکھلائیں گے شورِشِ بربط و نَے
وُہ شورِش جس کے آگے زبُوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے
آزاد ہَیں اپنے فکر و عمل، بھرپُور خزینہ ہمّت کا
اِک عمر ہَے اپنی ہر ساعت ، اِمروز ہَے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہَیں
یہ لَوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم، سب اپنے ہَیں

# تنہائی

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

○

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

# طوق و دار کا موسم

روِش روِش ہے وہی اِنتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
گراں ہے دِل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حُسنِ نگار کا موسم
خُوشا نظارۂ رُخسارِ یار کی ساعت
خُوشا قرارِ دِلِ بے قرار کا موسم
حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم
نصیبِ صُحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دِل کے داغ تو دُکھتے تھے یُوں بھی پر کم کم
کُچھ اب کے اَور ہے ہجرانِ یار کا مَوسم
یہی جُنُوں کا، یہی طَوق و دار کا مَوسم
یہی ہے جبر، یہی اِختیار کا مَوسم
قفس ہے بس میں تمُھارے، تمُھارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نِکھار کا مَوسم
صبا کی مَست خِرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا مَوسم
بلا سے، ہم نے نہ دیکھا تو اَور دیکھیں گے
فرُوغِ گُلشن و صَوتِ ہزار کا مَوسم

# سرِ مقتل

(قوّالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنّا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گذرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دِل، جمالِ رُوئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صَیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گُساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اُس کُوئے ملامت سے
کِسے روکے گا شورِ پندِ بے جا، ہم بھی دیکھیں گے
کِسے ہے جا کے لَوٹ آنے کا یارا، ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دِل والے
وُہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا، ہم بھی دیکھیں گے
وُہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اِس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا، ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صُبح پر چمکے گا تارا، ہم بھی دیکھیں گے

○

شفق کی راکھ میں جل بُجھ گیا سِتارۂ شام
شبِ فراق کے گیسُو فضا میں لہرائے

کوئی پُکارو کہ اِک عُمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نِکلے، نہ دِن کو ابر آئے

صبا نے پھر درِ زِنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دِل سے کہو نہ گھبرائے

# دو عشق

## (ا)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اَے ساقیِ گُل فام
وُہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہُوئے ایّام
وُہ پھُول سی کھِلتی ہوئی دِیدار کی ساعت
وُہ دِل سا دھڑکتا ہُوا اُمّید کا ہنگام

اُمّید کہ لو جاگا غمِ دِل کا نصِیبہ
تو شَوق کی ترسی ہُوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈُوب گئے دَرد کے بے خوابِ ستارے
اب چمکے گا بے صبر نِگاہوں کا مُقدّر

اِس بام سے نِکلے گا ترے حُسن کا خُورشید
اُس کُنج سے پھُوٹے گی کِرن رنگِ حِنا کی
اِس دَر سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھُولے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وُہ ہجر کے تپتے ہُوئے دِن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فُغاں بھول گئی ہے
ہر شب وُہ سیہ بوجھ کہ دِل بَیٹھ گیا ہے
ہر صُبح کی لَو تیر سی سِینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دِلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اِسی رنگ میں لَیلائے وطن کو
تڑپا ہے اِسی طَور سے دِل اُس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یُونہی شوق نے آسائشِ منزِل
رُخسار کے خم میں، کبھی کاکُل کی شِکن میں

اُس جانِ جہاں کو بھی یُونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دِی، کبھی رو رو کے پُکارا

پُورے کیے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر دَرد کو اُجیالا، ہر اِک غم کو سنوارا
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جُنوں کا
تنہا نہیں لَوٹی کبھی آواز جرس کی
خَیرِیّت جاں، راحتِ تن، صحّتِ داماں
سب بھُول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گُذرتی ہے وُہ گُذری
تنہا پسِ زِنداں، کبھی رُسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حُکم برسرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دُشنام
چھُوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادِم ہے مگر دِل
ہر داغ ہے اِس دِل میں بہ جُز داغِ ندامت

# اُن طَلَبہ کے نام

جو امن اَور آزادی کی جِدّو جُہد میں کام آئے

یہ کَون سخی ہیں
جن کے لہُو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کَون جواں ہیں ارضِ وطن
یہ لکھ لُٹ

جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
اِن آنکھوں نے اپنے نیلم
اِن ہونٹوں نے اپنے مرجاں
اِن ہاتوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی؟ کس ہات لگی؟

اے پوچھنے والے پردیسی!
یہ طفل و جواں

اُس نُور کے نَو رس موتی ہَیں
اُس آگ کی کچّی کلیاں ہَیں
جِس میٹھے نُور اَور کڑوی آگ
سے ظُلم کی اندھی رات میں پھُوٹا
صُبحِ بغاوت کا گُلشن
اَور صُبح ہُوئی من من، تن تن
اِن جسموں کا چاندی سونا
اِن چہروں کے نیلم مرجاں
جگ مگ جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھُومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن

# اگست ۱۹۵۲

رَوشن کہیں بہار کے اِمکاں ہُوئے تو ہیں
گُلشن میں چاک چند گریباں ہُوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہُوئے تو ہیں
ٹھہری ہُوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کُچھ کُچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہُوئے تو ہیں

اِن میں لہُو جلا ہو ہمارا، کہ جان وْ دِل
محفِل میں کُچھ چراغ فرُوزاں ہُوئے تو ہَیں

ہاں کج کرو کُلاہ کہ سب کُچھ لُٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردِشِ دَوراں ہُوئے تو ہَیں

اہلِ قفس کی صُبحِ چمن میں کھُلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ وْ پیماں ہُوئے تو ہَیں

ہَے دشت اب بھی دشت، مگر خُونِ پا سے فَیضؔ
سیراب چند خارِ مُغیلاں ہُوئے تو ہَیں

# نثار میں تری گلیوں کے....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دِل کے لئے اب یہ نظمِ بست و کُشاد
کہ سنگ و خشت مُقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظُلم کے دستِ بہانہ جُو کے لئے
جو چند اہلِ جنُوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مُدّعی بھی، مُنصِف بھی
کسے وکیل کریں، کِس سے مُنصِفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دِن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یُوں صُبح و شام کرتے ہیں
بُجھا جو روزنِ زِنداں تو دِل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسِل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دِیوار و در میں جیتے ہیں

یُونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظُلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یُونہی ہمیشہ کِھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھُول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اِسی سبب سے فلک کا گِلا نہیں کرتے
ترے فِراق میں ہم دِل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجُھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دِن کی خُدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجُھ سے عہدِ وفا اُستوار رکھتے ہیں
عِلاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

# زِنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم سِتاروں سے
زِینہ زِینہ اُتر رہی ہے رات
یُوں صبا پاس سے گُذرتی ہے
جَیسے کہہ دِی کِسی نے پیار کی بات
صحنِ زِنداں کے بے وطن اشجار
سرنگُوں، محو ہَیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نِگار
شانۂ بام پر دمکتا ہَے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل

خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

# زِنداں کی ایک صُبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ! سحر آئی ہے
جاگ! اِس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اُتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو وِدع کر کے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہُوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنوَر
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنوَل گِر گِر کر
ڈُوبتے، تیرتے، مُرجھاتے رہے، کِھلتے رہے
رات اَور صُبح بہت دیر گلے مِلتے رہے

صحنِ زِنداں میں رفیقوں کے سُنہرے چہرے
سطحِ ظُلمت سے دمکتے ہُوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے اُن چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا دَرد، فراقِ رُخِ محبُوب کا غم
دُور نوبت ہُوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد، فاقوں کے ستائے ہُوئے پہرے والے
اہلِ زِنداں کے غضب ناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے
لذّتِ خواب سے مخمُور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چوُر، صدائیں جاگیں

دُور دروازہ کُھلا کوئی، کوئی بند ہُوا
دُور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دُور اُترا کسی تالے کے جگر میں خنجر
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہُوئے دُشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہُوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کُناں
میرے بے کار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہ پُور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں اُمّید کے جلتے ہُوئے تیر

# اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے

اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

# دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تاب ناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے اُن کے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

# آجاؤ ایفریقا!

آ جاؤ، مَیں نے سُن لی تِرے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مشت ہو گئی میرے لہُو کی تال
"آجاؤ ایفریقا"

آجاؤ، مَیں نے دُھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، مَیں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، مَیں نے درد سے بازو چھُڑا لیا
آجاؤ، مَیں نے نوچ دِیا بے کسی کا جال
"آجاؤ ایفریقا"

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے مَیں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مِرگ نَین
دُشمن لہُو سے رات کی کالک ہُوئی ہے لال
"آجاؤ ایفریقا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مِرے ساتھ ایفریقا
دریا تھِرک رہا ہے تو بَن دے رہا ہے تال
مَیں ایفریقا ہُوں، دھار لیا مَیں نے تیرا رُوپ
مَیں تُو ہُوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"
آؤ ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"

# یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بے کل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو
یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو
پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اِک بار اُجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

# سنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہ سوار
صُبح دم مَوت کی وادی کو روانہ ہو گا؛
اب کوئی جنگ نہ ہوگی، نہ کبھی رات گئے
خُون کی آگ کو اشکوں سے بُجھانا ہو گا
کوئی دِل دھڑکے گا شب بھر، نہ کسی آنگن میں
وہمِ منحُوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم خُوں خوار درندے کی طرح آئے گا۔
اب کوئی جنگ نہ ہو گی، مے و ساغر لاؤ
خُوں لُٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہو گا۔
ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صُورت
مُطرِبا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صُورت

○

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقشِ ماضی مِٹے مِٹے سے
وُہ آزمائش دِل و نظر کی، وُہ قُربتیں سی، وُہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزُو کے صحرا میں آ کے رُکتے ہیں قافلے سے
وُہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وُہ سارے عُنواں وِصال کے سے

نِگاہ و دِل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وُہ جب مِلے ہیں تو اُن سے ہر بار کی ہے اُلفت نئے سِرے سے

بہُت گِراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سُبک تر، کہیں گوارا
وُہ دردِ پنہاں کہ ساری دُنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تُمہیں کہو رِند و مُحتسِب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں وُہ اُٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

○

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہ گار کھڑے ہیں
ہاں، جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

# شام

اِس طرح ہے کہ ہر اِک پیڑ کوئی مندِر ہے،
کوئی اُجڑا ہُوا ، بے نُور پُرانا مندِر،
ڈھُونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام ، ہر اِک در کا دمِ آخر ہے.
آسماں کوئی پُروہت ہے جو ہر بام تلے
جِسم پر راکھ ملے ، ماتھے پہ سِیندُور ملے
سرنگُوں بیٹھا ہے چُپ چاپ نہ جانے کب سے

اِس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جِس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یُوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوستہ ہے یُوں دامنِ شام
اب کبھی شام بُجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادُو ٹُوٹے
چُپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھُوٹے
دے کوئی سنکھ دُہائی، کوئی پایل بولے
کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھُونگٹ کھولے

# آج بازار میں پابہ جولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابہ جولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں، چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

اِن کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

# قیدِ تنہائی

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نُور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہُوا دَرد کا شہر
خواب ہی خواب میں بے تاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جُدائی میں سحر ہونے لگی؛
کاسۂ دِل میں بھری اپنی صبُوحی مَیں نے
گھول کر تلخیِ دِیروز میں اِمروز کا زہر

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نُور کی لہر
آنکھ سے دُور کسی صُبح کی تمہید لیے،

کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت
بے خبر گذری، پریشانیِ اُمّید لیے۔
گھول کر تلخیِ دیروز میں اِمروز کا زہر
حسرتِ روزِ مُلاقات رقم کی مَیں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رُخسار کے نام

# مُلاقات مِری

ساری دِیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بُجھ گئے، رُخصت ہُوئے رہ گیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہُوئی پھر رات مِری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے مُلاقات مِری؛
اِک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہُو
اِک نظر زہر لیے، ایک نظر میں دارُو
دیر سے منزلِ دِل میں کوئی آیا نہ گیا
فُرقتِ دَرد میں بے آب ہُوا تختۂ داغ
کِس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ؛
اَور پھر خُود ہی چلی آئی مُلاقات مِری،
آشنا موت جو دُشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے
وُہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دِلدار بھی ہے

# حمد

مِلکۂ شہرِ زندگی تیرا
شُکر کس طور سے ادا کیجے
دَولتِ دِل کا کُچھ شُمار نہیں
تنگ دستی کا کیا گِلا کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہُوئے
اُن کو تشویشِ روزگار کہاں
دَرد بیچیں گے گیت گائیں گے
اِس سے خُوش وقت کاروبار کہاں

اَور جب یاد کی بُجھتی ہُوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل، آخری لمحہ تری دِلداری کا،
دَرد اِتنا تھا کہ اُس سے بھی گُذرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی، مگر دِل نہ ٹھہرنا چاہا

جامِ چھلکا تو جم گئی محفل
مِنّتِ لُطفِ غمِ گُسار کسے

اشک ٹپکا تو کھِل گیا گُلشن
رنجِ کم ظرفیِ بہار کسے

خُوش نشیں ہیں کہ چشم و دِل کی مُراد
دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کَون ایسا غنی ہے جِس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے

جِس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

# ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بُجھ گئی دِل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ دَرد کا اب کیا ہوگا
اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو! ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لئے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھئے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

# رنگ ہے دِل کا مرے

تُم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے:
آسماں حدِّ نظر، راہ گُذر راہ گُذر، شیشہءِ مَے شیشہءِ مَے۔
اَور اب شیشہءِ مَے، راہ گُذر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دِل کا مرے، خُونِ جگر ہونے تک:
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دِیدار کا رنگ،
سُرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ،
زرد پتّوں کا، خس و خار کا رنگ،
سُرخ پھُولوں کا دہکتے ہُوئے گُلزار کا رنگ،

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شب تار کا رنگ۔
آسماں، راہ گذر، شیشۂ مے:
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دُکھتی ہوئی رگ،
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے۔
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ کوئی رُت، کوئی شے،
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اک بار ہر اِک چیز وہی ہو کہ جو ہے:
آسماں حدِّ نظر، راہ گذر راہ گذر، شیشۂ مے شیشۂ مے

# پاس رہو

تُم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دِلدار، مرے پاس رہو۔
جِس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہُو پی کے سِیَہ رات چلے
مرہمِ مُشک لیے، نشترِ الماس لیے
بَین کرتی ہُوئی، ہنستی ہُوئی، گاتی نِکلے
دَرد کے کاسنی پازیب بجاتی نِکلے؛
جِس گھڑی سِینوں میں ڈُوبے ہُوئے دِل
آستِینوں میں نِہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لیے؛

اور بچّوں کے بلکنے کی طرح قُلقُل مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے،
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے۔
جس گھڑی رات چلے،
جس گھڑی ماتمی، سُنسان، سیَہ رات چلے،
پاس رہو،
میرے قاتل، مرے دِلدار مرے پاس رہو

# دُعا

آئیے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی،
ہم جنھیں رسمِ دُعا یاد نہیں،
ہم جنھیں سوزِ محبّت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خُدا یاد نہیں۔
آئیے عرض گُذاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیِ فردا بھر دے:
وہ جنھیں تابِ گراں باریِ ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے؛
جن کی آنکھوں کو رُخِ صُبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منوّر کر دے؛
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے؛
جن کا دیں پیرویِ کذب و ریا ہے، اُن کو
ہمّتِ کُفر ملے، جُرأتِ تحقیق ملے؛
جن کے سر مُنتظرِ تیغِ جفا ہیں، اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے۔
عشق کا سرِ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے،
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے
آج اقرار کریں اور خلش مٹ